معارف

مئی ۲۰۲۱ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۳۵۰/روپئے۔ فی شمارہ ۳۰/روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴/روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۷۳۰/روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰/روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰/روپئے میں دستیاب۔

ہندوستان میں لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰/روپئے ہے۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

✆ (Ma'arif Section) 06386324437

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری/منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۷ ماہ رمضان المبارک ۱۴۴۲ھ مطابق ماہ مئی ۲۰۲۱ء عدد ۵

فہرست مضامین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

ایک سال پہلے یہی رمضان المبارک کا زمانہ تھا، عموماً عبادتوں کے موسم بہار کی حیثیت سے روزوں کی فضیلت، قرآن مجید کی اہمیت، آسانیوں کی بشارت اور دشواریوں سے راحت کی باتیں اس ماہِ مبارک کے طفیل میں کہی اور سنی جاتی تھیں لیکن گذشتہ رمضان میں اور پھر اس کے بعد انسانی زندگی کا موضوع اس کی بہبود و فلاح کی بجائے انسانی تاریخ کی سب سے ہلاکت خیز وبا و بلا کا ذکر ہو گیا، معارف نے اس وقت کہا تھا کہ اس مرض اور اس کے نتائج کی جو تصویر ماہرین پیش کر رہے ہیں وہ بے حد خطرناک ہے اور اس کے نتیجہ میں جس وسیع پیمانہ پر تباہ کاری کا اندیشہ ظاہر کیا جا رہا ہے وہ لرزہ خیز ہے۔

اپریل ۲۰ء میں جب ان خیالات کا اظہار کیا گیا تو یہ اندیشہ بھی سامنے آیا کہ انشاء اللہ یہ وقت بھی گزر جائے گا، البتہ جب یہ گزر جائے گا تو دنیا بہت کچھ بدل چکی ہوگی، یہ تو تقریباً طے ہے کہ یہ دنیا وہ دنیا نہیں ہوگی جس کے ہم عادی رہے ہیں، اس بدلی ہوئی دنیا کے خد و خال کیا ہوں گے یہ تو وقت ہی بتائے گا، دعا ہے کہ کل کی دنیا آج کی دنیا سے بہتر ہو۔

بہتری کی یہ خواہش اور دعا قطعی فطری اور قدرتی تھی، ہوا بھی کچھ ایسا ہی، ہر ملک نے اپنی بساط بھر اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنے کی کوشش کی، درمیان میں جو وقت ملا اس کو اس تحقیق میں صرف کیا گیا کہ اس وبا کا ازالہ کیسے ممکن ہو کہ انسان اپنی تاریخ کے سب سے بڑے خوف کے عالم سے نکل سکے، زمین اپنی وسعت کے باوجود اب لاشوں کے لیے تنگ نہ پڑے، کہیں کہیں یہ کوششیں کسی درجہ امید کی کرنوں میں بدلتی نظر آئیں لیکن اپنے ملک کے قرطاس قسمت پر کاتب ازل نے کچھ اور ہی لکھ دیا، جس کا نتیجہ اب ملک کے سامنے ہے کہ پورا ملک موت کے مہیب سایہ میں ہے، کرونا کے دوسرے حملہ نے اس ملک کو بے چارگی اور بے بسی کے ایسے مناظر سے دوچار کر دیا جس کا بیان قلم کے لیے گویا

ممکن نہیں، ہر روز ہزاروں جانیں لقمہ اجل بنتی جاتی ہیں اور بیماری کی لپیٹ میں جھلسنے والے تو لاکھوں ہی میں شمار میں آتے ہیں، دوا کے نام پر ویکسین کیا ملتی بڑے بڑے ہسپتالوں میں آکسیجن تک دستیاب نہیں، قصبات وقریات کا ذکر ہی کیا جہاں معالج تک غائب ہیں، کسی بھی حکومت کی ذمہ داری میں ترجیح، صحت، تعلیم اور روزگار کو ہوتی ہے لیکن جس حکومت کو پندار تفوق اور نشہ طاقت میں ذمہ داریوں کی ترجیحات کو سمجھنے کی توفیق نہیں ہوئی، اب اس کے عمل اور کردار کے تجزیہ نگاروں کو بالآخر کہنا پڑا کہ یہ سسٹم کی ناکامی ہے، نظام حکومت کیا ہے اور اسے کس طرح ہونا چاہیے؟ کاش ان سوالوں کو درمیانی وقفہ میں غور کے لائق سمجھا جاتا، لیکن یہ ہوتا کیسے؟ کبھی ذرائع ابلاغ محاسب کے فرائض انجام دیتے تھے، اب ان کی قلب ماہیت یوں کی گئی کہ وہ صرف مصاحب بن کر رہ گئے، نظام کے ذمہ دار جب صرف باتوں اور جملوں کے رسیا اور لاشوں کے رقص شرر پر مکروہ خندہ زنی کے عادی ہوں تو پھر کہنے والوں کو کہنے کا حق تو بہر حال رہے گا کہ ملک میں برپا یہ قیامت مرکزی حکومت کی سرتاسر کوتاہی کا نتیجہ ہے اور یہ نتیجہ صرف موجودہ حد تک محدود نہیں رہ سکتا، مستقبل قریب میں طبی ماہرین کے مطابق اس ابتلائے عظیم کے کم ہونے کے آثار کم کیا معدوم سے ہیں، تجربہ کار صحافی تو کہہ رہے ہیں کہ آئے دن اب تباہی وبربادی مزید وسیع تر ہوجائے گی اور اسے قابو میں لانا اسی درجہ مشکل ہوتا جائے گا۔

نظام کے نابینا اور ناکارہ ہونے کی ذمہ داری حکومت کے ساتھ ان لوگوں کی بھی ہے جنہوں نے کبھی صحت، تعلیم، روزگار، امن اور اشیائے ضروریہ کی بہ آسانی فراہمی کے بارے میں اس وقت قطعی نہیں سوچا جب وہ جذبات کی شدت میں بہہ کر اپنے ووٹ کا استعمال کرتے، جمہوریت میں مذہب، ذات، علاقہ، رنگ، نسل اور زبان جیسے مسکرات اور نشہ آور خوراکوں کی کمی نہیں، کبھی بازاری دوافروشوں کو ان کے گلے سے نکلتی ہوئی کریہہ آوازوں سے پہچان لیا جاتا تھا، معالجوں اور عطاروں اور دوافروشوں میں خاندان کے نام پر ان کی کئی پشتوں کی خدمات کا لحاظ کیا جاتا تھا، کاش سیاست کو تماش بینوں کے گھیرے سے آزاد کرانے کی چاہت اس ملک کی عادت ثانیہ بنادی جاتی، ہر بوالہوس کو حسن پرستی شعار بنانے کی اجازت نہ ہوتی اور پھر یہ رونا بھی نہ ہوتا کہ اب تو آبروئے شیوہ اہل نظر گئی، کیا یہ عجیب بات نہیں کہ کووڈ کے ایک سال سے کم عرصہ میں غریبی اور بے روزگاری کئی گنا بڑھ گئی لیکن ملک کے گنتی

کے چند سرمایہ داروں کے خزانے پہلے سے زیادہ بڑھ گئے، کاش اتنا شعور تو ہوتا کہ اپنے لیے ایک بہتر نظام کی تلاش میں سرمایہ داروں کے دام فریب پر نظر پڑ جاتی، لیکن سرمایہ دارانہ سیاست کو اصل مسائل سے کیا غرض، اس کو تو انتخابات اور مذہب کے نام پر میلوں ٹھیلوں کی افیم تقسیم کرنے میں ہی فائدہ نظر آتا ہے، اقتدار اور سیاسی مفاد کی چاہت، انسانی جان کی قیمت پر برداشت کے قابل نہیں لیکن آج جس معاشرہ کو محض ایک بھیڑ میں بدلا جارہا ہے اس سے یہ امید رکھنا عبث ہے کہ وہ خود کی اور دوسروں کی حفاظت کے لیے تیار ہوسکے گا، جس ملک میں آکسیجن کے ایک سلنڈر کے لیے لوگ ڈاکٹروں کے پیروں پر گرکر گڑگڑاتے ہوں اسی ملک میں پنچایت جیسے بے فائدہ الکشنی تماشوں میں جشن انبوہ کا سماں دکھائی دے اور وہاں کی حکومت آکسیجن برآمد کرنے کے نئے ریکارڈ بنانے میں مصروف ہو صحیح کہا گیا کہ یہ حکومت کی ایسی سفاکی ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، ایک بات اور کتنا صحیح اور کتنے آسان الفاظ میں کہنے والے نے کہا کہ ملکی سیاست کا مذہبی رخ صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں بلکہ خود جمہوریت کے لیے تباہ کن ہے، مذہبی نعروں پر پنپنے والی حکومت میں جمہوریت کا کوئی مقام نہیں ہوتا، یہاں لفظ مذہبی کو عام سمجھنے کی ضرورت ہے، اکثریت کی طرح اقلیت کے مذہبی نعروں میں بجز تباہی کے اور کچھ نہیں، کیونکہ نعرے فقط آواز ہیں جن سے پہلے یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے۔

ایک سال سے ہر رسالہ اور اخبار کا ایک گوشہ گویا شام غریباں کا حصہ بن گیا، ماتم کی اب کوئی حد نہیں رہ گئی، مولانا ولی رحمانی اور انیس چشتی کے بعد تو جانے والوں کے قافلے تھمتے نظر نہیں آتے، کوئی کہاں تک نام گنائے، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، افتخار امام صدیقی، مشرف عالم ذوقی، ڈاکٹر مولا بخش، ڈاکٹر احسان اللہ فہد، مولانا فضل الباری، ان کے چھوٹے بھائی عبید الباری، مولانا انیس احمد اصلاحی، مولانا مقبول احمد فلاحی، شوکت حیات، ڈاکٹر رخسانہ لاری، مولانا قمر الزماں مبارکپوری، مولانا وحید الدین خان، فرقان سنبھلی اور خدا جانے کتنے سب رخصت ہوگئے، کہاں جاتے ہیں یہ سب، جواب تو معلوم ہے پھر بھی پوچھنے والوں کی نظریں سوالیہ نشان بن جاتی ہیں کہ نہیں معلوم تہہ خاک تماشہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ سب کی مغفرت فرمائے اور امت پر، قوم پر، ملک پر اور ساری دنیائے انسانیت پر رحم فرمائے، عذاب کی تباہیوں کو دیکھ کر پیغمبروں کی زبان بھی سب جانتے ہوئے کہہ اٹھتی تھی ''وَاِلَّا تَغْفِرْلِیْ وَتَرْحَمْنِیْٓ اَکُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ''۔

مقالات

محمد ہاشم کشمی کا فارسی دیوان

(چند مخطوطات کا جائزہ)

☆ڈاکٹر عارف نوشاہی ☆☆ڈاکٹر عطا خورشید

خواجہ محمد ہاشم کشمی بدخشی، ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۱ یا ۱۰۰۲ھ/۱۵۹۳ میں کشم (Keshm) میں پیدا ہوئے، کشم، افغانستان کے شمال مشرق میں واقع صوبہ بدخشان کا ایک ضلع ہے جسے مقامی اصطلاح میں 'ولسوالی' کہتے ہیں۔ محمد ہاشم کی تاریخ ولادت ان کی اپنی تحریروں سے اخذ کی گئی ہے۔ ایک جگہ وہ اپنے ایک خواب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''در سال ہزار و ہژدہ کہ راحلۂ زندگی بہ مرحلۂ ہژدہ سالگی رسیدہ بود۔'' (محمد ہاشم، نسمات القدس، ص ۱۲) یعنی ۱۰۱۸ھ میں جب زندگی کا مسافر اٹھارہویں مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس سے تخمین لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ۱۰۰۰ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ محمد ہاشم نے اپنے چھوٹے بھائی محمد اسحاق کی وفات کا سال ۱۰۴۰ھ (مادّہ تاریخ ''غم'') لکھ کر اُس وقت اپنی عمر چالیس سال بتائی ہے:

دیدم ہزار غم بہ چہل سالگی زتو　　اندر ہزار و چل کہ ''غم'' او شمار بود

(محمد ہاشم، دیوان ہاشم کشمی، ورق ۱۸۳الف)

دوسری جگہ انھوں نے چالیس سلاسل طریقت کے مختصر تعارف پر مبنی اپنے رسالہ طُرق الوصول فی شریعۃ الرسول کی تاریخ تصنیف ۱۰۴۲ھ/ ۱۶۳۲ اور اپنی عمر چالیس سال بتائی ہے:

این چل بچہل سالگیم گشت پناہ　　باد این چہلم ماحِیِ چل سالہ گناہ

پرسند گر از تو سال این نقش بدیع　　گو: ''حال سلاسل مجاذیب اللہ''

(محمد ہاشم، طرق الوصول، ورق ۲۳الف)

☆ادارہ معارف نوشاہیہ، پاکستان۔ ☆☆مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

ہم ۱۰۰۰ھ کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ اس پر ان کی دو شہادتیں جمع ہوگئی ہیں۔

انھوں نے ایک جگہ اپنا پورا نام اور نسبت یوں لکھی ہے: ''محمد الہاشم ابن محمد القاسم النعمانی النقشبندی البدخشانی'' (محمد ہاشم، طرق الوصول فی شریعۃ الرسول، ورق ۵ ب) ان کے والد محمد قاسم (م ۱۰۱۲ھ/ ۱۶۰۳) بھی عالم و فاضل تھے، محمد ہاشم نے ان کی وفات کا قطعۂ تاریخ اپنے دیوان میں لکھا ہے:

آن کس کہ نمک بود بہ خوانِ فضلا از صحبت او تازہ روانِ فضلا
بُود او ہمہ آنِ فضلا، گفت خرد تاریخ وفاتش ''ہمہ آنِ فضلا''

(محمد ہاشم، دیوان ہاشم کشمی، ورق ۱۷۹ ب)

محمد ہاشم کے دیوان میں ایک قطعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دادا محمد ہاشم کے حین حیات زندہ تھے جن کی خدمت میں محمد ہاشم نے ایک منظوم قطعہ بھیجا تھا۔ یہ قطعہ اس وقت بھیجا گیا جب محمد ہاشم کے والد بیمار تھے اور ان کے دادا باغ کی سیر کو گئے ہوئے تھے۔ انھیں بلانے کے لیے یہ قطعہ بھیجا۔

تنہا تو سرو روانی روان شو آخر چند چو سروہای چمن ساکن چمن بودن
ہزار باغ نہان درتواین چہ عشوہ گریست بہ باغ رفتن و درسیر خویشتن بودن
بوَد ترا بہ تو بودن بہ ہر کجا حاصل بیا کہ بی تو نیاید مرا بہ من بودن

(محمد ہاشم، دیوان ہاشم کشمی، ورق ۱۷۲ ب؛ نسخۂ ندوہ ۶۵ ب میں لفظ جدّی کے ساتھ سلمہ اللہ بھی لکھا ہے۔)

محمد ہاشم کے دو اور بھائی بھی تھے جو ان کی زندگی ہی میں فوت ہوگئے۔ ایک بھائی ابوالفتح محمد اسحاق، بہت خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کی ولادت پیر کی رات، ۱۲ شعبان ۱۰۳۷ھ (مادۂ تاریخ ''راہنماے خلق'') / ۱۶۲۸ کو ہوئی۔ ان کی ولادت کا محمد ہاشم نے یہ قطعۂ تاریخ کہا:

در صدر شب دوشنبہ شعبان بود بگذشتہ دوازدہ کہ این بدر نمود
اسحاق نامش گو، کنیت بوالفتح خوان ''راہنماے خلق'' تاریخ وجود

(محمد ہاشم، دیوان ہاشم کشمی، ۱۸۱ الف؛ نسخۂ ندوۃ العلما، ۶۹ ب میں مادہ تاریخ الف کے بغیر ''رہنماے خلق'' کتابت ہوا ہے۔ اس کے مطابق سال ولادت ۱۰۳۶ بنتا ہے۔)

محمد اسحاق ابھی تین سال کے تھے کہ ۱۰۴۰ھ میں فوت ہوگئے۔ اس تاریخ کے لیے شاعر نے برمحل مادّہ "غم" استعمال کیا ہے، اس وقت محمد ہاشم کی اپنی عمر چالیس سال تھی۔ ان کی وفات پر محمد ہاشم نے قصیدوں اور رباعیوں کی صورت میں جانسوز مرثیے لکھے:

دیدم ہزار غم بہ چہل سالگی ز تو　　اندر ہزاو و چل کہ "غم" او شمار بود

(محمد ہاشم، دیوان ہاشم کشمی، ورق ۱۸۳الف)

زین زخمہ تازہ گشت چہل سالہ زخم دل　　جاسوس بی نوایِ من شد نوای من

(محمد ہاشم، دیوان ہاشم کشمی، ۱۸۴الف)

اشعار میں متوفی کی کم سنی کی طرف بھی اشارہ ہے:

از بس کہ بود آمدنش توام شدن　　نشناختم ز بی گہ او بہ گاہ او
در غنچگی گل تو بہ پژ مرد و تازہ گشت　　بس داغ ہای کہنہ ازین داغ نو بہ تو

رباعیات

اسحاق بسی مدت عمرت کم بود　　دُر تو درین باغ مگر شبنم بود
در لجہ عمر اگر نبودی تو حباب　　بودِ تو بہ نابود چرا توام بود
بابا اسحاق رفتن زود چہ بود　　عمرت کہ ز سہ سال نیفزود چہ بود
از تاب غم تو جملگی آہ دلیم　　این شعلۂ سر تا بہ قدم زود چہ بود
گل بی تو شرر شد بہ خس بستان ریخت　　در آب شد و ازمژۂ نیسان ریخت
از سال "غم" تو طفل شیری کہ دو سال　　از پستان خوردہ بود، از مژگان ریخت

(محمد ہاشم، دیوان ہاشم کشمی، ورق ۱۸۲الف، ۱۸۵الف)

محمد ہاشم کے دوسرے بھائی محمد قاسم عرف "خضری"، بہت خوبصورت اور پسندیدہ تھے، لیکن وہ بھی دو سال کی عمر میں فوت ہوگئے۔ ان کی وفات پر بھی شاعر نے مرثیہ لکھا۔ اس مرثیہ کے دوسرے شعر سے معلوم ہوتا کہ ان کی وفات سے ایک سال قبل بھی شاعر کا کوئی عزیز فوت ہوا تھا اور وہ اس کے غم میں نڈھال تھے۔ یہ عزیز محمد اسحاق ہو سکتے ہیں، جن کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔

شد ازسحاب گریۂ سوگ پسر مرا　　ہر موی گلبن گل داغ جگر مرا

پیرار بودم از پسری رہن صد گداز امسال سوخت ماتم طفل دگر مرا
قاسم برفت و قسمت من خون دل ازو از خوان مہر بس بوَد این ماحضر مرا
خضری برفت و گریہ کنان من ز پی کہ بود زین آب خضر بہرہ ہمین چشم تر مرا
زین بادۂ دو سالہ بہ میخانۂ دو کون آخر نبود بہرہ بجز درد سر مرا
(محمد ہاشم، دیوان ہاشم کشمی، ۱۸۵، ب)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ محمد ہاشم کشمی کے والد ۱۰۱۲ھ میں انتقال کر گئے تھے، پھر ان کے دو بھائی ۱۰۳۸ اور اس کے بعد کیسے دنیا میں آئے؟ دیوان ہاشم کے دونوں نسخوں (علی گڑھ اور ندوۃ العلما) میں محمد اسحاق اور محمد قاسم خضری کے ناموں کے ساتھ شاعر نے اپنا رشتہ واضح طور پر ''برادر'' لکھا ہے۔ محمد اسحاق کے ضمن میں نسخۂ علی گڑھ (ورق ۱۸۲ب)، نسخۂ لاہور (ورق ۳۲۵الف) اور نسخۂ ڈھاکا میں ''برادرم'' اور نسخۂ ندوہ (ورق ۵۲ب) میں ''برادر خود'' لکھا ہے۔ محمد قاسم خضری کے ضمن میں نسخۂ علی گڑھ میں ''برادر دوم فقیر'' (ورق ۱۸۵ب) اور نسخۂ ندوہ میں ''برادر دوم خود'' (ورق ۵۵ب) لکھا ہے۔ نسخۂ لاہور میں یہ قطعہ موجود نہیں ہے۔ ان دونوں کے سوگ میں محمد ہاشم نے جو مرثیے لکھے ہیں ان کے لب ولہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بطور بھائی نہیں بلکہ بطور باپ انھیں یاد کر رہے ہیں اور آہ وبکا کر رہے ہیں۔

محمد اسحاق کے مرثیے کا یہ شعر:

پیراہن سفید کہن کو کہ شد سفید از بس کہ بی جمال تو چشم پدر گریست
(محمد ہاشم، دیوان ہاشم کشمی، ۱۸۳، الف)

جان پدر ! پدر زغمت بس جزع نمود باشد کہ عصمت تو شود عذرخواہ او
(محمد ہاشم، دیوان ہاشم کشمی، ۱۸۳، ب)

محمد قاسم کے مرثیے کے یہ دو اشعار پہلے بھی نقل ہو چکے ہیں:

شد از سحاب گریۂ سوگ پسر مرا ہر موی گلبن گل داغ جگر مرا
پیرار بودم از پسری رہن صد گداز امسال سوخت ماتم طفل دگر مرا

وہ ان مرثیوں میں بتکرار 'یعقوب' اور 'یوسف' کے استعارے استعمال کر کے جدائی کا دکھ بیان کرتے ہیں۔ ظاہر ہے حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السلام کا رشتہ باپ بیٹے کا تھا۔

یعقوب وش بہ دجلۂ اشک آشنا شدم یک آشنا نداد ز یوسف خبر مرا

(محمد ہاشم، دیوان ہاشم کشمی، ۱۸۶الف)

مختصر یہ کہ ان مرثیوں میں ایسے کئی استعارے اور تراکیب ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد اسحاق اور محمد قاسم خضری ان کے بیٹے تھے، لیکن نسخوں میں واضح طور پر بھائی لکھا ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے جواہر ہاشمیہ کے حوالے سے محمد ہاشم کے ایک بیٹے محمد کاظم عرف محمد قاسم مدفون برہان پور کا ذکر کیا ہے۔ بہر حال یہ معما تا حال حل نہیں ہوسکا۔ یہ گمان بھی کرنا چاہیے کہ مصنف نے اپنے والد کا جو مادہ تاریخ وفات (ہمہ آن فضلا) دیا ہے شاید وہ اصل تاریخ وفات کے مطابق نہ ہو لیکن یہ دیوان کے تمام قلمی نسخوں میں جو ہم دیکھ سکے ہیں ایسے ہی ہے۔

محمد ہاشم کے آبا و اجداد کی وابستگی سلسلۂ کبرویہ سے تھی اور وہ خود بھی بچپن میں کبرویہ بزرگوں کی صحبت میں جاتے رہے ہیں لیکن جب وہ اپنے وطن سے شیخ طریقت کی تلاش میں ہندوستان آئے تو یہاں برہان پور میں میر محمد نعمان بدخشی (م۱۰۵۹ھ/ ۱۶۴۹) سے ملاقات ہوئی۔ ان سے ذکر اور مراقبے کی تعلیم پائی۔ محمد ہاشم کے نام کے ساتھ "نعمانی" نسبت اسی وجہ سے ہے۔ پھر میر محمد نعمان کی اجازت اور راہ نمائی سے ۱۰۳۱ھ/ ۱۶۲۱ میں شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (م۱۰۳۴/۱۶۲۴) کی خدمت میں سرہند حاضر ہوئے اور تقریباً دو سال، سفر و حضر میں ان کے ساتھ رہے (محمد ہاشم، نسمات القدس، ص۵)۔ رجب ۱۰۳۳ / ۱۶۲۴ میں واپس برہان پور چلے گئے۔ میر محمد نعمان نے اپنی بیٹی ان کے عقد میں دے دی تھی جن کے بطن سے ان کا ایک بیٹا محمد کاظم (عرف محمد قاسم) اور ایک بیٹی صفیہ خاتون پیدا ہوئی۔ محمد ہاشم نے برہان پور میں وفات پائی۔ وہ خود اور ان کی اولاد وہیں مدفون ہیں۔

محمد ہاشم کے مزار کی کیفیت: پنجاب یونیورسٹی لاہور میں شعبۂ تاریخ کے پروفیسر محمد اسلم (م۱۹۹۸) جولائی ۱۹۶۸ میں ایک بار محمد ہاشم کشمی کا مزار دیکھنے کے لیے خاص طور پر برہان پور گئے اور وہاں پہنچنے کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے۔ انھوں نے مزار پر نصب کتبہ (بورڈ) کی عبارت کو ہو بہو نقل کیا ہے۔ اس تحریر کے مطابق محمد ہاشم کی وفات ۱۰۴۵ھ میں ہوئی۔ پہلے انھیں برہان پور میں عیدگاہ کے قریب پانڈہ رول ندی کے کنارے دفن کیا گیا۔ ۱۲۷۲ھ میں سیلاب کے خطرے کے پیش نظر آپ کا صندوق وہاں سے نکال کر موجودہ جگہ سیوا سدن کالج کے احاطے میں دفن کیا گیا۔ (محمد اسلم،

سفرنامۂ ہند، ص ۱۳۹۔۱۴۱؛ تاریخی مقالات، طبع اول، ص ۱۶۳) ہم نے زیرنظر مقالہ لکھتے وقت، برہان پور کے ایک معتبر باشندے سعید احمد صاحب سے مزار کی موجودہ کیفیت کے بارے میں معلوم کیا تو انھوں نے بتایا کہ محمد ہاشم کی دوسری تدفین جس جگہ پر عمل میں آئی وہ اُس وقت ایک غیر آباد وسیع و عریض میدان تھا لیکن اب وہاں آبادی ہوگئی ہے اور وہ علاقہ راجو نگر کہلاتا ہے اور مزار کے قریب کی آبادی ہاشم پورہ کہلاتی ہے۔ انگریزی دور میں اس میدان میں سینٹ رابرٹسن ہائی اسکول قائم ہوا جس کا نام آزادی ہند کے بعد سبھاش ہائی اسکول رکھ دیا گیا۔ اسی اسکول کے نزدیک بعد میں سیوا سدن کالج بنا، سعید احمد صاحب نے ہمیں مزار کی تصاویر بھی بھیجی ہیں۔ مزار کی سطح زمین سے کافی بلند ہے، مزار کا داخلہ دروازہ لوہے کا جالی دار ہے جس سے اندر قبر نظر آتی ہے۔ خود قبر ایک چھوٹی سی چوکھنڈی کے اندر ہے۔ مزار کی عمارت پر سفید گنبد بنا ہوا ہے۔ مجموعی طور پر مزار کی عمارت کی حالت قابل تعریف نہیں ہے۔ داخلی دروازے پر سبز رنگ کے ایک بورڈ پر جلی قلم سے اردو اور انگریزی میں ''وقف درگاہ حضرت خواجہ سید ہاشم کشمی'' لکھا ہے۔ نیچے انتظامیہ کمیٹی کے ممبران کے نام ہیں: الحاج محمد رفیع ابن محمد اسحاق (عرف مُنّا) صدر؛ الحاج ڈاکٹر محبوب صاحب شیخ سکریٹری۔

محمد ہاشم کی تاریخ وفات کے اختلافات: محمد ہاشم کشمی کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ محمد صادق ہمدانی کشمیری (م ۱۰۵۲ھ/ ۱۶۴۲) نے، جو ان کے ہم عصر اور انھیں ذاتی طور پر جانتے تھے، محمد ہاشم کی وفات بعمر چالیس سال ۱۰۴۱ھ/ ۱۶۳۱ میں بتائی ہے (طبقات شاہ جہانی، طبقہ عاشرہ، ج ۲، ص ۲۵۳)۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے پہلے ۱۰۴۳/۱۶۳۳ء تک انھیں زندہ بتایا ہے (تحقیق، ص ۳۶) اور بعد میں ان کی تاریخ وفات بحوالہ جواہر ہاشمیہ، ۱۱/رجب ۱۰۴۵ھ/ ۱۶۳۵ء لکھی ہے (تحقیق، ص ۳۷) ڈھاکا یونیورسٹی میں محفوظ دیوان ہاشم کشمی کے کاتب نے محمد ہاشم کی تاریخ وفات کا جو قطعہ لکھا ہے اس میں مادّہ ''گونزد رسول ہاشمی شد'' ہے جس سے ۱۰۴۳ھ برآمد ہوتا ہے (کلیم سہسرامی، ص ۱۹۸) محمد اقبال مجددی نے مقامات معصومی کے مقدمے میں ان تمام تاریخوں کو رد کرکے ۱۰۴۱ھ کو درست مانا ہے (مقدمۂ مقامات معصومی، ج ۱، ص ۲۷۲۔۲۷۳) لیکن اپنی بعد کی تحریروں میں ۱۰۴۳ھ کو قرین صواب قرار دیا ہے (تذکرۂ علما و مشائخ پاکستان و ہند، ج ۲، ص ۸۲۶؛ تعلیقات مکتوبات امام ربانی، ج ۴، ص ۲۶۲)۔ اشپرنگر نے دیوان محمد ہاشم میں شامل قطعات تاریخ کو مدّنظر رکھتے ہوئے کہا ہے کہ

بظاہر محمد ہاشم ۱۰۵۶ھ/ ۱۶۴۶ء تک بقید حیات تھے (ص ۴۲۰) لیکن ہمیں ان کے دیوان میں ایسا کوئی قطعہ نہیں ملا جو اس تاریخ سے متعلق ہو۔ عجائب گھر لاہور کے نسخۂ کلیات محمد ہاشم میں درج ایک یادداشت کے مطابق محمد ہاشم کی وفات بروز جمعہ ۲۶ رمضان ۱۰۵۹/ ۱۶۴۹ء کو ہوئی اور روزینہ انجم نقوی نے اسے مستند قرار دیا ہے (ص ۳۱)۔ محمد اقبال مجدّدی نے یہ نسخہ دیکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ ۱۰۵۹ھ نہیں بلکہ ۱۲۵۹ھ ہے اور یہ کسی اور محمد ہاشم کا سنہ وفات ہے! (تذکرۂ علما و مشائخ پاکستان و ہند، ج ۲، ص ۸۲۶) اس یادداشت اور تاریخ وفات کے بارے میں ہم دیوان ہاشم کشمی نسخۂ لاہور کے تعارف میں اصل حقیقت بیان کریں گے۔ دیوان ہاشم کشمی میں قطعات تاریخ کے حصے میں جس متاخر ترین تاریخ کا ذکر ہوا ہے وہ ۱۰۴۳ھ ہے۔ اس سے کم از کم یہ تو مسلّم ہے کہ وہ مذکورہ سال تک زندہ تھے۔ دوسرا یہ کہ ہمیں اب تک محمد ہاشم کی کسی ایسی تصنیف کا سراغ نہیں ملا جو ۱۰۴۳ھ کے بعد کی ہو۔ یہ سب قرائن اس پر دالّ ہیں کہ وہ ۱۰۴۳ھ/۱۶۳۳ء میں وفات پا گئے تھے۔

محمد ہاشم کشمی بطور مصنف: محمد ہاشم کشمی سلسلۂ نقشبندیہ مجدّدیہ کی ایک اہم علمی شخصیت ہیں۔ انھوں نے فارسی زبان میں کئی کتب و رسائل تصنیف کیے۔ ان کے اہم ترین علمی کاموں میں ایک، مکتوبات امام ربّانی شیخ احمد سرہندی کے تیسرے دفتر کی جمع و تدوین ہے۔ یہ کام ۱۰۳۱ھ/ ۱۶۲۲ میں مکمل ہوا۔ ان کی ایک اور اہم کتاب زبدۃ المقامات یا برکات الاحمدیہ الباقیہ ہے جو ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۸ میں ختم ہوئی اور ۱۰۴۰ھ/ ۱۶۳۱ تک اس پر اضافے ہوتے رہے، جیسا کہ خواجہ حسام الدین احمد کے حالات کے ضمن میں آیا ہے کہ وہ ۱۰۴۰ھ میں زندہ ہیں (''امروز کہ سال ہزار و چہل ہجریست''، محمد ہاشم کشمی، زبدۃ المقامات، ص ۸۶؛ غلام مصطفی خان، تحقیق، ۲۸ نے اسی عبارت کو ہزار و چہل و سہ ۱۰۴۳ لکھا ہے)۔ زبدۃ المقامات خواجہ باقی باللہ اور حضرت مجدّد اور ان کے نامور خلفا کا تذکرہ ہے۔ محمد ہاشم کا ایک اور اہم تذکرہ، نسمات القدس من حدائق الانس ہے جو حدود ۱۰۴۱ھ/ ۱۶۳۲ میں تصنیف ہوا۔ یہ علی بن حسین واعظ کاشفی سبزواری (م ۹۳۹ھ) کی تصنیف رشحات عین الحیات کا تکملہ اور ذیل ہے۔ اس کے مخطوطات مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان راول پنڈی، مکتوبہ ۱۲۰۲ھ (شمارہ ۱۰۴۰۷)، کتب خانۂ عارف حکمت مدینہ منورہ (مکتوبہ ۱۲۴۸ھ)، البیرونی انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل سٹڈیز تاشقند مکتوبہ ۱۲۰۵ھ (شمارہ ۳۸۸) اور جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ

لینگویجز، سری نگر، تاریخ خرید ۱۲۲۳ھ (شمارہ ۲۷۴) میں ہیں (محمد ابراہیم، ج ۱، ص ۲۴۸-۲۴۹)۔ نسمات القدس پر ایک پاکستانی طالب علم ڈاکٹر منیر جہاں ملک نے بطور پی ایچ ڈی تھیسز تہران یونیورسٹی میں کام کیا ہے لیکن یہ تاحال شائع نہیں ہوا۔ سید محبوب حسن واسطی نے نسمات القدس کے نسخۂ عارف حکمت کی بنیاد پر اس کا اردو ترجمہ کیا جو ۱۴۱۰ھ میں سیال کوٹ سے شائع ہو چکا ہے۔ محمد ہاشم کے دیگر مختصر رسائل کا ایک قلمی مجموعہ پیر ابوالخیر عبداللہ جان مجدّدی (م ۲۰۲۰) کے ذاتی کتب خانۂ خیریہ، محلّہ مرشد آباد، پشاور میں ہے۔ اس مجموعے میں ان کے مندرجہ ذیل رسائل شامل ہیں: حلیہ رسول اللہ، طُرق الوصول فی شریعۃ الرسول، نسمات القدس (صرف مقدمہ)، روداد تدوین مکتوبات امام ربانی، مکتوبات ہاشم کشمی، احوال حضرت قاسم شیخ کرمینی، قدر العالی فی اسرار خیر اللیالی، گوہر نامی سرّ اسرار نام سید الانامی۔ (عارف نوشاہی، نقد عمر، ۴۳-۵۷)۔ اب یہ قلمی مجموعہ، عکسی صورت میں، پروفیسر محمد اقبال مجددی کے مقدمے کے ساتھ لاہور، ۲۰۱۷ سے شائع ہو گیا ہے۔ اس قلمی مجموعے میں شامل ایک رسالہ حلیہ رسول اللہ، عارف نوشاہی نے مرتب کر کے الگ سے بھی شائع کر دیا ہے (عارف نوشاہی، مقالات عارف، جلد ۲، ص ۵۹۹-۶۱۷)۔ محمد ہاشم نے نسمات القدس اور طُرق الوصول میں جا بجا اس بات کا اظہار کیا ہے کہ وہ جامی کی نفحات الانس کے اسلوب پر مشائخ وصوفیہ کا ایک تذکرہ صفحات الانوار من مقامات الاخیار نام سے لکھیں گے۔ لیکن یہ متحقق نہیں ہو سکا آیا وہ یہ تذکرہ لکھ پائے؟ اس نام سے کوئی کتاب ابھی تک ہماری نظر سے نہیں گذری۔ چونکہ نسمات القدس ۱۰۴۱ھ میں اور طرق الوصول ۱۰۴۲ھ میں لکھی گئیں اور ایک خیال ہے کہ محمد ہاشم کی وفات ۱۰۴۳ھ میں ہوئی، اس لیے اس بات کا احتمال کم ہی ہے کہ انھوں نے ۱۰۴۲ اور ۱۰۴۳ کی درمیانی قلیل مدّت میں صفحات الانوار جیسی ضخیم کتاب تصنیف کی ہوگی۔

محمد ہاشم کشمی بحیثیت شاعر: محمد ہاشم کا بحیثیت شاعر، فارسی ادب کی تاریخوں اور شعرا کے تذکروں میں کم ہی تذکرہ ہوا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ہوا ہی نہیں، تو بے جا نہ ہوگا۔ فارسی شعرا کے کم وبیش سبھی اہم تذکروں کی بنیاد پر مرتب ہونے والی عبدالرسول خیام پور کی فرہنگ سخنوران (انتشارات طلایہ، تہران ۱۳۷۲ش/۱۹۹۳) میں ہاشم کشمی کا قطعاً کوئی ذکر نہیں ہے جس کا بالواسطہ یہی مطلب ہے کہ تمام اہم تذکرے ان کے بحیثیت شاعر ذکر سے خالی ہیں۔ اسی نوعیت کی ایک اور فرہنگ، آثار الشعرا میں

سید محمد اکرم اکرام نے ''ہاشم کشمی'' کے ذیل میں ان کے حالات کے لیے جن تذکروں کی نشان دہی کی ہے (ص ۴۹۲) ان میں سوائے نبی ہادی کی انگریزی کتاب Dictionary of Indo-Persian Literature کے باقی تمام سات مآخذ میر ہاشم کشمیری یا کسی اور ہاشم شاعر سے متعلق ہیں اور تخلص کی مشابہت سے آثار الشعرا کے مرتب کو دھوکا ہوا ہے اور مآخذ کو خلط ملط کردیا ہے۔

محمد ہاشم کشمی نے فارسی شاعری کی تمام مقبول اصناف جیسے غزل، رباعی، مثنوی، قطعہ، مخمس وغیرہ میں بہت جاندار اشعار کہے ہیں، اتنے کہ ان سے ایک دیوان مرتب ہوگیا۔ صاحبِ دیوان ہونے کے باوجود افسوس ہے کہ تذکرہ نگاروں نے انھیں نظر انداز کیا ہے۔ ان کے دیوان کا وہ حصہ جو تاریخی قطعات پر مشتمل ہے، بہت اہم اور کارآمد ہے۔ ان قطعات سے محمد ہاشم کے وابستگان، معاصر مشایخ اور عمارات و واقعات کی تاریخیں بہم پہنچتی ہیں۔ دیوان کے علاوہ، ان کی دیگر تصانیف میں بھی جا بجا ان کا کلام ملتا ہے۔ اگر یہ کلام بھی جمع کرکے ان کے دیوان کے ساتھ شامل کردیا جائے تو صحیح معنی میں ان کا کلیات اشعار کہلائے گا۔ ان کا کلام دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم بلاغت کی کچھ صنعتوں کے شوقین تھے، تاریخ گوئی میں خاص مہارت تھی اور اصول موسیقی سے بھی واقف تھے۔

ان کا فارسی دیوان تا حال مکمل شائع نہیں ہوا۔ لیکن ان کے دیوان سے بعض معاصرین جیسے مولانا اختر محمد خان مصنف جواہر ہاشمیہ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر کلیم سہسرامی، پروفیسر محمد اسلم وغیرہ نے محمد ہاشم کشمی سے متعلق اپنی تحریروں میں ان کا مختصر نمونۂ کلام دیا ہے۔ محمد ہاشم کے دیوان سے ۲۴۸ غزلوں کا ایک انتخاب ڈاکٹر روزینہ انجم نقوی نے غزلیات محمد ہاشم کشمی نام سے دارالنوادر، لاہور سے ۲۰۲۰ء میں شائع کروایا ہے۔ یہ اشاعت انڈیا آفس اور لاہور میوزیم کے نسخوں پر مبنی ہے۔ قرأت متن کی لغزشوں اور پروف خوانی میں تساہل نے اس مجموعۂ غزلیات کو مجموعۂ اغلاط بنا کر رکھ دیا ہے۔

اس وقت ہمارا موضوعِ سخن ''دیوان محمد ہاشم کشمی'' ہے، اس کے حصۂ قطعات میں متاخر ترین تاریخ ۱۰۴۳ھ ہے جو خواجہ حسام الدین احمد کی وفات سے متعلق ہے جس سے گمان کیا جاسکتا ہے کہ یہ دیوان اس سال یا اس کے فوراً بعد جمع و مرتّب ہوا ہے۔ ہمارے اس مضمون کا بنیادی مقصد محمد ہاشم کشمی کے فارسی دیوان کے معلوم نسخوں کو متعارف کرنا ہے تا کہ کوئی صاحب ذوق اس طرف متوجہ ہوکر ان کا مکمل دیوان مرتب کرنے کے لیے کمر ہمت باندھے، جو نسخے ہمارے علم میں آئے ہیں، ان کا

ذکر تاریخ کتابت کے اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ پہلے حصے میں تاریخ دار نسخے اور دوسرے حصے میں بلا تاریخ نسخے متعارف ہوئے ہیں۔ چونکہ علی گڑھ، لکھنو اور لاہور کے نسخے ہماری دسترس میں ہیں، اس لیے ان کے مندرجات کا تعارف قدرے تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

نسخۂ اودھ (۱۰۶۶ھ): یہ نسخہ شاہ اودھ کے کتب خانوں کی زینت تھا۔ تاریخ کتابت ۱۰۶۶ھ ہے۔ اشپرنگر نے اسے عمدہ نسخہ بتایا ہے اور احتمال ظاہر کیا ہے کہ مصنف کے لیے لکھا گیا ہوگا (اشپرنگر، ص ۴۲۰)۔ اشپرنگر کا یہ بیان درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اگر یہ نسخہ مصنف کے لیے لکھا گیا ہے تو محمد ہاشم کا ۱۰۶۶ تک زندہ رہنا بھی ثابت کرنا ہوگا جس کی تایید میں قرائن موجود نہیں ہیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ کلکتہ اور علی گڑھ کے نسخوں کی تاریخ بھی ۱۰۶۶ھ ہے۔ عین ممکن ہے کہ سلطنت اودھ کے انقراض کے بعد شاہ اودھ کے کتب خانے کا یہی نسخہ وہاں منتقل ہوا ہو۔

نسخۂ کلکتہ (۱۰۶۶ھ): یہ نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ (شمارہ Nb151) میں ہے۔ تاریخ کتابت ۱۰۶۶ھ، خط عمدہ نستعلیق، ۱۸۳ ورق ہیں۔ ایوانف نے اس نسخے کے مندرجات کا تعارف لکھا ہے (ایوانف، ص ۳۳۸ [مسلسل شمارہ ۷۴۷])۔ یہاں تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

نسخۂ علی گڑھ (۱۰۶۶ھ): یہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، (شمارہ: ضمیمہ فارسیہ ادب، شمارہ ۱۷۲) میں موجود ہے۔ دراصل یہ نسخہ ذخیرۂ ابومحمد کا ہے۔ پہلے اس پر شمارہ Per.Poem Univ.59 لگایا گیا لیکن بعد میں جب یہ ذخیرہ، یونیورسٹی کلیکشن میں ضم ہوگیا تو نیا شمارہ (یونیورسٹی کلیکشن، فارسیہ ادب، شمارہ ۱۷۲) دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ فہرست میکروفیلم نسخہ ہای خطی فارسی و عربی کتابخانہ مولانا آزاد دانش گاہ اسلامی علیگر ہند، ج ۱، ص ۱۶۴؛ تاریخی مقالات، ص ۱۶۸ اور نقد عمر، ص ۵۵ میں یہ پرانے نام اور شمارے کے تحت متعارف ہوا ہے۔

آخر میں ترقیمہ موجود ہے۔ کاتب نے اپنا نام نہیں لکھا اور صرف تاریخ کتابت ۵ ربیع الثانی ۱۰۶۶ھ لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ اگر ہم محمد ہاشم کشمی کا سال وفات ۱۰۴۳ھ مان لیں تو یہ نسخہ ان کی وفات کے محض ۲۳ سال بعد کتابت ہوا ہے۔ نسخہ مکمل، لیکن کرمخوردہ ہے۔ کاغذ قدامت کے سبب مٹیالا ہوگیا ہے۔ حفاظت کی خاطر کاغذ کے ایک طرف بٹر پیپر چڑھا دیا گیا ہے، جس کے سبب قرأت میں دشواری ہوتی ہے۔ اصل نسخے میں ۱۸۷ ورق تھے، جیسا کہ کاتب نے ورق شمار لکھا ہے، لیکن ورق ۱۱۳ اور ۱۱۴

(دوورق کا ایک جزو) درمیان سے غائب ہے جس کے سبب اب یہ نسخہ ۱۸۵ ورق پر مشتمل رہ گیا ہے۔ ہم نے ان نقص کو نظر انداز کرکے، کاتب ہی کے لکھے ورق شمار کا حوالہ دیا ہے۔ مسطر ۱۷ سطور کا ہے۔ خط نستعلیق عمدہ اور باآسانی پڑھا جانے والا ہے، عنوانات تمام شنگرف میں ہیں، رکابے کا اہتمام نہیں ہے۔ نسخے کے مندرجات اور محتویات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ظہریہ (سرورق): اس صفحے پر کچھ پرانی تحریریں ہیں۔ بخط متن سرخ روشنائی سے "دیوان حضرت خواجہ ہاشم" لکھا ہے۔ ملکیت کی ایک قدیم یادداشت بھی ہے: "من متملکات احقر عباداللہ محمد عتیق اللہ ولد محمد خلیل اللہ نقشبندی الرضائی غفراللہ۔" سلسلۂ نقشبندیہ کی ہندوستان میں "رضائی" شاخ سے وابستہ اس بزرگ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ سرورق پر ایک چوکور مہر بھی ثبت ہے جس میں بخط نستعلیق یہ سجع کندہ ہے: چراغ روشن است از محب اللہ۔

۱۔ قصاید: ق ا ب سے ق ۷ الف تک آٹھ نعتیہ قصاید، نعتیہ ترجیع بند اور نعتیہ مثنوی ہے۔ پہلا نعتیہ قصیدہ سراپاے نبوی کا مضمون ہے۔ مطلع یہ ہے:

اگر پُرسی ز قدّش، سروِ باغ راستان آمد　　ستون بارگاہ پادشاہ لامکان آمد

ترجیع بند کا ٹیپ کا شعر یہ ہے:

اوشد سبب اظہار ربوبیت حق را　　زین پس بشکن خامہ و در پیچ ورق را

نعتیہ مثنوی کی تاریخ تصنیف لفظ "ختم" (۱۰۴۰ھ) سے نکلتی ہے اور اس کا پہلا اور آخری شعر یہ ہے:

چون جمال خواجہ بود اول بہار　　از گلستان ظہور کردگار

بود چون او ختم جملہ انبیا　　نظم شد در سال "ختم" این مدعا

۲۔ رباعیات، ق ۷ الف سے ۱۱ ب تک ۵۲ رباعیات لکھی ہیں جن میں یہ خصوصیت ہے کہ آخری مصرع میں قرآن کی کسی آیت سے تضمین کی ہے۔ پہلی رباعی:

اکوان ہمہ پرتواند و اعیان ہمہ ماہ　　ہل پرتو مہ بجرم مہ می جُو رہ

اشیا ہمہ وصف و ذاتشان وجہ اللہ　　كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ

ق ۱۱ ب سے ۱۶ الف تک ۴۸ ایسی رباعیات لکھی ہیں جن کے آخری مصرع میں احادیث

نبوی سے تضمین کی گئی ہے، ان رباعیات کے آغاز میں سرخ روشنائی سے درج ذیل عنوان قائم کیا گیا ہے:

الرباعیات المضمنات من الاحادیث النبویہ علے قایلھا الصلوات والتحیہ، پہلی رباعی:

پرسید یکی ز خواجۂ ہر دو سرا ای خیرِ رُسل شر چہ بود ؟ قال: آلّا
اِنّ شَرَّ الشَّرِّ شِرارُ العُلَمَاء واِنّ خَیرَ الخَیرِ خِیَارُ العُلَمَآء

ایک اور مثال:

ایوان قدم فراتر از ہفت افلاک عقلست چو مور لنگ افتادہ بخاک
غایت عجز ست گفت ازان نائب پاک اَلْعَجزُ عَنْ دَرَکِ الإِدْرَاکِ إِدْرَاکٌ

۳۔ ترجیع بند، ق ۱۶ ب تا ۲۴ ب۔ ترجیع بند قصیدے شروع ہوتے ہیں، پہلے ترجیع بند قصیدے کا پہلا شعر ہے:

دَم صبح برخاست، بوی کشیم بہ صحرا گوَ زنانہ ہوی کشیم

اور اس کا ٹیب کا شعر یہ ہے:

گر این لیلی از خیمہ بیرون شود بسا کوہ و صحرا کہ مجنون شود

دوسرے ترجیع بند کا ٹیپ کا شعر یہ ہے:

جز محیط شراب جملہ سراب فاتقو اللہ یا اولوا الالباب

ق ۲۵ الف سادہ ہے۔

۴۔ ساقی نامہ: مسمی بہسبعہ سیارہ مرغان آتش خوار، ق ۲۵ ب تا ۲۸ ب، سبعہ سیارہ کی مناسبت سے ہر بند کو 'اختر' کہا ہے اور یہ کل سات بند (اختر) ہیں۔ پہلا شعر:

ساقی بدہ آن آب کہ او آتش طور ست آن نار کہ او غازۂ رخسارۂ حورست

۵۔ ق ۲۹ الف تا ۲۹ ب، ۳۱ شعروں پر مشتمل "منقبت حضرت قطب العارفین سلطان المحققین خواجہ بہاء الحق والحقیقت والدّین نقشبند قدس اللہ سرہ العزیز" ہے۔

پہلا شعر:

بستہ از قدرت نقاش ازل نقش دگر کلک رنگین زبان بر ورق لخت جگر

آخری شعر:

بیندار ہاشم ازین کوچہ عبیرِ گردی گرددش ہر بُن مو نافۂ مشک اذفر

ق ۳۰ الف سادہ ہے۔

۶۔مثنویات، پہلی مثنوی درشان حضرت مجدد الف ثانی، ق ۳۰ ب تا ۴۳ الف، ۴۲۷ شعروں پر مشتمل اس مثنوی کا عنوان اس طرح درج ہے: ''ہاوہوی اضطراب وآرام، وگفت وگوی آغاز و انجام، بلسان ساغروصہبای مُل، بزبان ہمہ اشیا، مسمی ''نجم وحدت'' تاریخ'' وخلت'' [۱۰۳۶] ارمغان محفل عنادل چمن زار، ولقا بخشِ باغ ہزار، ساقی خم خانۂ خداوندی، شیخنا وامامنا احمد الفاروقی النقشبندی ایداللہ تعالی ظلال جلالہ الی یوم الدین۔'' اس مثنوی کا نام نجم وحدت ہے اور تاریخ تصنیف ۱۰۳۶ھ ہے۔اس کے اندر مزید چند حکایتیں ہیں۔

پہلا شعر:

سحر خفتہ بودم در آغوش خویش برسم دل و خواب خرگوش خویش

آخری شعر:

بتاج الرُسل خاتم الانبیا سر ابتدا، سرور انتہا

دوسری مثنوی لدھہ نامی درویش کا قصہ ہے، ق ۴۳ ب تا ۵۷ الف۔ یہ مناجات اور استغاثہ (بلاعنوان) سے شروع ہوتی ہے۔پہلا شعر:

خداوندا بزخم سینہ ریشان بموئی از جنون دل پریشان

اس استغاثہ میں شاعر نے التزام یہ رکھا ہے کہ خدا کو مختلف چیزوں کی قسمیں دی ہیں۔ایک مقام پر شاعر نے پینتالیس سلاسل طریقت کے مشائخ کے نام لے کر قسم دی ہے۔اس مثنوی کے ذیلی عنوانات یہ ہیں، ''منقبت پیر طریقت قدس سرہ'' (۵۰ الف)، شیخ احمد سرہندی کی مدح ہے، یہ چند اشعار وہاں سے ہیں:

کنوں چوں میل ہندستان در افتاد مرا عود جگر در مجمر افتاد

کہ آن قندی کہ شیرین تر ز جانست کنون در خطۂ ہندوستانست

الا سودائیان شہریست در ہند کہ اندر پای او بنہادہ سرہند

اسی ضمن میں شاعر نے ہندوستان سے اپنی محبت کا اظہار بھی کیا ہے:

ز بس سودای ہندم در نہاد است　　حکایت ہای من ہم زان بلاداست
چرا نبوَد کہ جان جانم آنجاست　　شکر ریز لب ایمانم آنجاست
(ورق ۵۱ب، ۵۲الف)

''درعذر تاخیر تحریر بمرشد پاک ضمیر میر محمد نعمان سلمہ اللہ المنان کہ باعث این نظم اند'' (ق ۵۲ الف) پہلا شعر:

الا جویای نظم این لآلی　　ہمہ از دوست پُر، و زخویش خالی

''قصہ درویش لدھہ نام کہ او درین نامۂ بہ مسکین معبری گرددو معشوقش بہ نگارین'' (ق ۵۲ب تا ۵۷ الف) پہلا شعر:

بیارم امشب آن نادر فسانہ　　کہ از تابش زبانم شد زبانہ

آخری شعر:

ہمی کن ختم خط این مقالہ　　بمہر مہر آن ختم الرسالہ

۷۔ غزلیات، ق ۵۷ب تا ۱۳۰ب غزلیات ہیں۔ یہ کل ۲۵۰ غزلیں ہیں۔ تمام غزلیں ردیف وار ہیں، ہر ردیف کی غزلیات کی تعداد قوسین میں درج کی جاتی ہے:

الف (۱۷)، ب (۳)، ت (۴۷)، ث (۱)، ج (۱)، ح (۱)، خ (۱)، د (۵۸)، ذ (۱)، ر (۶)، ز (۳)، س (۲)، ش (۴)، ص (۱)، ض (۱)، ع (۱)، غ (۱)، ف (۱)، ق (۲)، ک (۲)، ل (۳)، م (۴۴)، ن (۱۳)، و (۱۲)، ہ (۷)، ی (۱۷)۔ ورق ۱۱۲ب پر ردیف میم میں ایک غزل کے مندرجہ ذیل شعر کے بعد، دو ورق غائب ہیں:

ندانم گل بلبل شب چہ گفتی کز سرشک خون　　سحر خاشاک کاخش سر بسر گلزار می بینم

اس کے بعد ورق ۱۱۵الف آجاتا ہے جو ردیف میم کی ایک غزل کے اس شعر سے شروع ہوتا ہے:

یوسف بیا بہ خواب تو خود گو نشان خویش　　ما خود خبر ز ہیچ و یاری نیافتیم

۸۔ رباعیات، ق ۱۳۰ب تا ۱۷۰الف ردیف وار ۴۶۹ رباعیات ہیں۔

۹۔ ''غزل مشتمل بیان دوازدہ مقام و بیست و چہار شعبہ وشش آوازہ واوقات ہریک وانواع

تغنی'' عنوان سے ۱۶ اشعار پر مشتمل ایک غزل ہے ق ۷۰ اب - ۷۱ االف، اس غزل سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد ہاشم موسیقی کے بنیادی اصولوں سے بھی واقف تھے۔ یہ تمام اصول ایرانی یا خراسانی موسیقی سے متعلق ہیں، ہندوستانی موسیقی سے متعلق نہیں ہیں۔

۱۰۔ فردیات، ق ۱۷۱ االف - ۱۷۲ االف، فردیات کے تحت ۱۲۳ اشعار ہیں۔ آخر میں ایک رباعی بھی ہے۔

۱۱۔ قطعات وتواریخ، تواریخ کے ضمن میں ہم نے کوشش کی ہے کہ شاعر یا کاتب نے جو مادۂ تاریخ لکھا ہے اس کے مطابق تاریخ نکال کر درج کی جائے۔ ایتھے نے انڈیا آفس کے نسخے کے تعارف کے ضمن میں صرف چند تاریخیں درج کی ہیں۔ بعض تاریخوں میں ہمارا اور ایتھے کا اختلاف بھی ہے۔ ممکن ہے انڈیا آفس کے نسخے میں مادّہ کسی اور طرح سے درج ہو یا ایتھے سے استخراج اعداد میں کوئی غلطی واقع ہوئی ہو۔

''قطعہ دربیان اقسام ثلثہ سخن'' (ق ۱۷۲ االف)، بقول شاعر نظم اور نثر میں سخن کی صرف تین قسمیں ہیں، ایک میں لفظ ناقص اور معنی کامل، دوسری میں لفظ کامل اور معنی ناقص، اور تیسری میں لفظ و معنی ہر دو کامل ہوتے ہیں۔

''درجواب قطعہ ظل گفتہ بودند'' (ق ۱۷۲ االف - ۱۷۲ ب)

''این قطعہ رابحضرت جدّی فرستادہ بود آن دم کہ ایشان بہ سیر باغ بودند و والدی بر بالین رنجوری''۔ (ق ۱۷۲ االف)

''دررموز نام نامی حضرت ایشان قدس سرہ'' (ق ۱۷۲ اب)، ''حضرت ایشان'' سے مراد شیخ احمد سرہندی ہیں۔

''مستزاد اشارہ بہ بعضی اسرار اسم حضرت ایشان قدس سرہ''۔ (ق ۱۷۲ اب - ۱۷۳ االف)

''نظم اسامی پیران باعزّ وجاہ از حضرت ایشان تا حضرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' (ق ۱۷۳ االف)، شیخ احمد سرہندی سے آنحضرت تک مشائخ کے ناموں پر مشتمل لامیہ قصیدہ (شجرہ نامہ) ہے۔

''تاریخ وفات حضرت مولانا خواجگی امکنہ علیہ الرحمۃ بہ تعمیہ'' (ق ۱۷۳ اب) ۱۰۰۰ھ ''خضر اشک از رخ خود پاک می کرد''، یعنی خضر کا رخ ''خ'' کو صاف کردیں تو ''ض ر'' باقی رہتا ہے جس کے

اعداد کا مجموعہ ۱۰۰۰ھ ہے۔

''تاریخ وفات حضرت مخدومی خواجہ عبدالباقی قدس سرہ'' (ق ۱۷۳ب) ''بحر معرفت بوڈ'' ۱۰۱۲ھ۔

''تاریخ وصال حضرت ایشان اعنی شیخنا امامنا احمد الفاروقی قدس سرہ العزیز'' (ق ۱۷۳ب)، ۱۰۳۴ھ، اس عنوان کے تحت آٹھ قطعات درج ہیں۔ ان میں ایک قطعہ کے ہر چہار مصراع سے سال وصال برآمد ہوتا ہے۔ (۱۷۴ب)

''این شصت وسہ فقرہ کہ برطبق سال عمر حضرت ایشان است۔ ہر یک تاریخ وصال آن قدوۂ صفا کیشان است قدس اللہ تعالی روحہ وافاض علینا فتوحہ'' (ق ۱۷۴ب) شیخ احمد سرہندی کی عمر (۶۳ سال) کے مدّنظر ان کی وفات کے تریسٹھ مادہ ہائے تاریخ لکھے ہیں۔ اس میں کچھ فارسی اور کچھ عربی ہیں۔

''این قطعہ ایست تاریخ وصال درو منصوص علیہ وحرف ثانی ہر مصراع مبیّن سال عمر حضرت ایشان قدس سرہ العزیز'' (ق ۱۷۵ب) [حروف ثانی: وم زی = ۶۳]

''درین قطعہ نیز تاریخ وصال منصوص است وحروف اول ہر مصراع کہ حاضر محصول اوست تاریخ بدوِ سال خلافت حضرت ایشان است قدس سرہ'' (ق ۱۷۵ب)، اس قطعے میں دو طرح سے تاریخیں بیان کی ہیں، ایک شیخ احمد سرہندی کی تاریخ وفات اور دوسرا ہر مصراع کے حروف اول کے مجموعہ سے ان کی تاریخ خلافت نکلتی ہے۔ (ح اض ر ۱۰۰۹)

''ازین رباعی برتوشیح مرتب لفظ ''تخلد'' بیرون آید کہ سال وصال حضرت ایشان است'' (ق ۱۷۵ب)، شیخ احمد سرہندی کے وصال کی تاریخ میں رباعی بصنعت توشیح ہے۔ توشیح کا لفظ ''تخلد'' ہے جس سے سال وصال [۱۰۳۴] برآمد ہوتا ہے۔

''رباعی کہ حروف معجمہ از ہر مصراع او معلم انتقال پادشاہ ملک آمدہ وحروف اول ہر مصراع مصرع اسم مکرم او۔ روحہ اللہ روحہا۔'' (ق ۱۷۶الف)، اس رباعی میں بھی دو صنعتیں ہیں۔ دوسری صنعت میں رباعی کے ہر مصرعے کے پہلے حرف سے نام ''احمد'' نکلتا ہے۔ پہلی صنعت جس میں یہ کہا گیا ہے کہ رباعی کے نقطہ دار حروف سے کچھ برآمد ہوتا ہے، قابل فہم نہیں ہے۔

"این رباعی برعکس نخستین است و نیز حروف ابتدای او بیان ولادت آن شیخ دین" (ق ۱۷۶ الف)، رباعی کے ہر مصرعے کے پہلے حروف کا مجموعہ "اخشع" سے شیخ احمد سرہندی کا سال ولادت ۹۷۱ ظاہر ہوتا ہے۔ ہاشم کشمی نے زبدۃ المقامات میں انھی حروف کو ادل بدل کر کے لفظ "خاشع" کو مادّہ بنایا ہے۔

"ہر مصرع این رباعی غیر معجمہ تاریخ وصال حضرت ایشان است قدس سرہ ......توشیح نام آنحضرت ازو مستخرج" (ق ۱۷۶ الف) لیکن کاتب نے رباعی نہیں لکھی ہے، جگہ خالی چھوڑ دی ہے۔

"این چہل فقرہ ہر یک تاریخ اتمام دفتر اول مکتوبات حضرت ایشانست قدس سرہ" (ق ۱۷۶ الف)، مکتوبات امام ربانی کے پہلے دفتر کی تاریخ جمع آوری کے لیے چالیس مادہ ہائے تاریخ کہے ہیں۔

"این چہل فقرہ ہر یک تاریخ انتقال مخدوم زادۂ بزرگ شیخ محمد صادق علیہ الرحمہ کہ جامع بود میان ظاہر و باطنہ" (ق ۱۷۶ ب۔ ۱۷۷ ب)، خواجہ محمد صادق بن شیخ احمد سرہندی کی وفات پر چالیس مادّہ ہائے تاریخ منظوم کیے ہیں۔ ایک مادّہ "رفتہ در طاعون" ۱۰۲۵ ہے۔

"مرثیۂ حضرت مخدوم زادہ" (ق ۱۷۷ ب۔ ۱۷۸ ب) خواجہ محمد صادق کا مرثیہ۔ مطلع:

باز آسمان بدیدۂ ابر بہار چیست آشفتہ ہمچو زلف بتان روزگار چیست؟

تاریخ وفات محمد بن فضل اللہ (ق ۱۷۸ ب) "ابن فضل اللہ" ۱۰۲۹ھ

"تاریخ وفات شیخ عیسی [سندھی] قدس سرہ العزیز" (ق ۱۷۸ ب) "شیخ اکمل" ۱۰۰۱ھ

"تاریخ انتقال السید میرک شاہ رحمۃ اللہ علیہ" (ق ۱۷۸ ب۔ ۱۷۹ الف) "ھو سید الشیوخ" ۱۰۳۲ھ، یہ قطعہ عربی میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محمد ہاشم کشمی عربی میں بھی شعر کہہ لیتے تھے۔

"تاریخ وفات شیخ علم اللہ محدث رحمۃ اللہ علیہ" (ق ۱۷۹ الف) "استاد اہل حدیث" ۱۰۲۴ھ۔

"تاریخ وفات مولانا دانشمند دانشمند بدخشانی رحمہ اللہ تعالیٰ" (ق ۱۷۹ الف) "لُجۂ شریعت بود" ۱۰۳۰ھ۔

"تاریخ وفات حضرت حکیم معنوی میر مومن بلخی کبروی رحمہ اللہ" (ق ۱۷۹ الف) ۱۰۳۱ھ "بیان المومن مرآت المومن" ۱۰۳۸ھ، یہ مادّہ بطور نثر الگ لکھا ہے۔ منظوم قطعہ میں جو مادّہ تاریخ (این مومن مرآت نامہ مومن بود) دیا گیا ہے ہمارے حساب سے اس کے اعداد تاریخ وفات کے مطابق نہیں ہیں۔

''تاریخ وفات کامل عالم شیخ طاہر خلیفۂ حضرت ایشان'' (ق ۱۷۹ الف) ''شیخی بود دانا و ولی'' ۱۰۴۰ھ۔

''تاریخ وفات عارف آگاہ میر عبداللہ احرار رحمہ اللہ علیہ'' (ق ۱۷۹ ب) ''خواجہ احرار'' ۱۰۲۵ھ، یہ خواجہ عبید اللہ احرار (م ۸۹۵ھ) نہیں ہیں۔

''تاریخ وفات خدمت ولایت پناہ خلیفۂ حضرت خواجہ باقی باللہ المتخلق باخلاق الصمد خواجہ حسام الدین احمد رحمہ اللہ علیہ'' (ق ۱۷۹ ب) ''ولی نافع خلق اللہ'' ۱۰۴۳ھ، یہ اس دیوان میں متاخرترین تاریخ ہے۔

''تاریخ وفات قاضی شکر رحمہ اللہ علیہ'' (ق ۱۷۹ ب) ''شکر اللہ سعیہ بالکرم'' ۱۰۲۴ھ۔

''تاریخ وفات مولانا معصوم رحمہ اللہ علیہ'' (ق ۱۷۹ ب) ''مروّج شرع نبی نماند'' ۱۰۲۶ھ۔

''تاریخ وفات والد خود خواجہ محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ فرمودہ'' (ق ۱۷۹ ب) ''ہمہ آن فضلاً'' ۱۰۱۲ھ۔

''تاریخ وفات خواجہ عثمانی رحمہ اللہ'' (ق ۱۸۰ الف) ''وہ آن سمی خلیفہ سیم کو'' ۱۰۲۳ھ۔

''تاریخ وفات شیخ حسن قادری رحمہ اللہ'' (ق ۱۸۰ الف) ''شیخ حسن'' ۱۰۲۸ھ، لیکن ان کا سال وفات ۱۰۲۶ ہے، شاعر نے بطور لطیفہ تاریخ اس طرح کہی ہے کہ اگر شیخ دو سال بعد رخصت ہوتے تو ان کی تاریخ ''شیخ حسن'' ہوتی۔

شیخ بعد دوسال اگر می رفت   سال تاریخ بود شیخ حسن

''تاریخ وفات سید محمود رحمہ اللہ علیہ'' (ق ۱۸۰ الف) ''عاقبت ایشان محمود باد'' ۱۰۴۰ھ۔

''تاریخ وفات عصمت اللہ لاہوری غفر اللہ لہ'' (ق ۱۸۰ الف) ''الجنۃ المثواہ'' ۱۰۳۶ھ۔

''تاریخ وفات خانخانان عبدالرحیم'' (ق ۱۸۰ الف) ''خان سپہسالار کو'' ۱۰۳۶ھ۔

''تاریخ بنای حوض مسجد جامع کہ حضرت سیدی مرشدی میر محمد نعمان بنا فرمودہ اند'' (ق ۱۸۰ الف) ''حوض نعمان'' ۱۰۲۵، میر محمد نعمان نے برہان پور کی جامع مسجد کا حوض تعمیر کروایا تھا۔

''تاریخ جلوس ثانی صاحقران شاہ جہان سلمہ اللہ بالعدل والاحسان'' (ق ۱۸۰ ب) ''زینت شرع'' ۱۰۳۷ھ۔

''تاریخ قصر عالی شاہ جہان خرم شاہ غازی زاد قدرہ زین آباد برہانپور بنا نمودند'' (ق ۱۸۰

ب) ’’دوام منزل خرم باد‘‘ ۱۰۲۵ھ، برہان پور میں شہزادہ خرم (شاہ جہان) کے بنوائے ہوئے محل کی تاریخ ہے۔

’’تاریخ بنای مسجد جامع عظمیٰ کہ سلطان وقت مدّظلہ العالی در دارالسلطنت آگرہ بناء فرمودہ اند‘‘ (ق ۱۸۰ب) ’’رفیق بیت المقدس‘‘ ۱۰۳۷ھ، بادشاہ وقت [شاہ جہان] کی آگرہ میں بنوائی ہوئی بڑی جامع مسجد کی تاریخ ہے۔

’’تاریخ بنای مسجد خان جہان‘‘ (ق ۱۸۰ب) ’’جامع الفیض‘‘ ۱۰۳۵ھ۔

’’تاریخ بنای مسجد کہ اقبال و سعادت آثار فخر الدین احمد ولد محمدی بیگ المخاطب بہ ہیبت خاں بنا نہادہ بر مزار فایض الانوار حضرت ایشان قدس سرہٗ در سرہند‘‘ (ق ۱۸۰ب) ’’جامع فیض الٓہ‘‘ ۱۰۴۰ھ، سرہند میں شیخ احمد سرہندی کے مزار پر فخر الدین احمد ولد محمدی بیگ مخاطب بہ ہیبت خان کی بنوائی ہوئی مسجد کی تاریخ ہے۔

’’تاریخ تجدید بنای صفہ محاوط مسجد بزرگ ــــــ برہانپور کہ بسعی ایشان و عطیہ میر نعمان بظہور پیوستہ‘‘ (ق ۱۸۰ب ـ ۱۸۱الف) ’’تجدید الشریف‘‘ ۱۰۴۲ھ، میر محمد نعمان کی کوشش سے برہان پور کی بڑی مسجد کے صفہ کی تجدید عمارت ہوئی تھی۔

’’تاریخ ولادت برادرم محمد اسحاق‘‘ (ق ۱۸۱الف) ’’راہنمائے خلق‘‘ ۱۰۳۷ھ۔

’’در تاریخ تجدید عمارات مسجد اعظم برہانپور کہ بسعی ایشان و ہمت مولانا عبد اللطیف وقوع یافتہ، فرمودہ اند‘‘ (ق ۱۸۱الف) ’’عمارت جدید شد‘‘ ۱۰۳۶ھ، برہان پور کی بڑی مسجد کی مولانا عبد اللطیف کی کوشش سے تجدید عمارت کی تاریخ ہے۔

’’تاریخ حوض بزرگ کہ در شارستان برہانپور ظہور یافتہ‘‘ (ق ۱۸۱الف) ’’حوض اکبر‘‘ ۱۰۳۷ھ، یہ حوض برہان پور میں شاہ جہان کے حکم پر خان جہان نے بنوایا تھا۔

۱۲۔ متفرقات (غزلیات مصنوع، رباعیات، مراثی): ’’ھو الاول والآخر، این چہار غزل کہ در اوّل بیت ہمان حرف آخر است در ردیف مشکل باشارہ شاہزادہای عالی مرتبہ مدّظلہم نظم نمودہ اند‘‘ (ق ۱۸۱الف ـ ۱۸۲ب)، چار غزلیں جن کے ہر مصراع کا پہلا حرف، اس غزل کی ردیف کا آخری حرف بھی ہے، یہ مشکل ردیفیں انھوں نے شاہزادہ ہاے عالی مقام کی فرمائش پر اختیار کی ہیں۔

پروفیسر محمد اسلم کا قیاس ہے کہ یہ شاہزادہ ہاے عالی مرتبہ شجاع اور اورنگ زیب ہو سکتے ہیں جو کچھ عرصہ برہان پور میں رہے تھے اور محمد ہاشم کا ان سے ربط وضبط ہوگا (ص ۱۷۶)۔

''این پنج بند و نہ رباعی را در مرثیۂ برادرم کہ بہ ہمہ اوصاف طاق بود و نامش محمد اسحاق، فرمودہ اند'' (ق ۱۸۲ب۔۱۸۵ب)؛ بھائی محمد اسحاق کے سوگ میں پانچ الگ الگ بند اور نو رباعیات لکھی ہیں۔(رباعیات کی درست تعداد دس ہے۔)، پہلا بند:

ابر چمن ز ہجر تو ای گل شرر گریست شام اجل ز ابر سیہ بیشتر گریست

''این قصیدہ را در مرثیہ برادر دوم فقیر کہ نامش محمد قاسم بود و لقبش خضری و بغایت جمیل و مقبول و بدو سالگی از جہان رفت، فرمودہ اند'' (ق ۱۸۵ب۔۱۸۷الف)، اپنے دوسرے بھائی محمد قاسم ملقب بہ خضری کے سوگ میں مرثیہ جو بہت خوب صورت تھا اور دو سال کی عمر میں چل بسا۔ قصیدے کے آخر میں دو رثائی رباعیاں بھی ہیں۔ نسخہ اس رباعی پر ختم ہوتا ہے:

زین واقعہ خون اشک شدہ غازۂ من از نوحہ بلند گشتہ آوازۂ من
گویند گل تازہ برآید از خاک در خاک درآمد آن گل تازۂ من

۱۳۔ ترقیمہ (ق ۱۸۷الف): ''پنجم شہر ربیع الثانی سنہ ۱۰۶۶ قلمی شد۔''

دیوان محمد ہاشم کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ اسے خود شاعر نے مرتب و مدوّن کیا یا ان کے کسی مرید یا شاگرد نے؟ نسخۂ علی گڑھ میں نظموں کی سرخیوں میں کہیں تو واحد متکلم کا اظہار ہے یعنی خود شاعر کا بیان ہے اور کہیں جمع غائب کا صیغہ ہے جیسے کوئی دوسرا شخص احتراماً محمد ہاشم کے لیے لکھ رہا ہے، جیسے: ''این پنج بند و نہ رباعی را در مرثیۂ برادرم کہ بہ ہمہ اوصاف طاق بود و نامش محمد اسحاق، فرمودہ اند'' (ق ۱۸۲الف)؛ ''این قصیدہ را در مرثیہ برادر دوم فقیر کہ نامش محمد قاسم بود و لقبش خضری و بغایت جمیل و مقبول و بدو سالگی از جہان رفت، فرمودہ اند'' (ق ۱۸۵ب)۔ ان جملوں میں 'برادرم' اور 'فقیر' سے لگتا ہے کہ خود محمد ہاشم لکھ رہے ہیں، لیکن 'فرمودہ اند' سے معلوم ہوتا کہ کسی دوسرے شخص کی طرف سے احتراماً کہا گیا ہے۔ ممکن ہے ''فرمودہ اند'' کا اضافہ کاتب کی طرف سے ہو۔

پروفیسر محمد اسلم نے سفر علی گڑھ میں یہ نسخہ دیکھا تھا اور بقول خود، اس کا بغور مطالعہ کیا اور اس میں سے کافی کچھ نقل بھی کیا۔ انھوں نے اس نسخے کے کچھ مشمولات کا تعارف اور محمد ہاشم کے کلام کا ایک

مختصر انتخاب اپنے مقالے ''خواجہ محمد ہاشم کشمی'' میں دیا ہے جو ان کی کتاب ''تاریخی مقالات'' کی اشاعت اول ندوۃ المصنّفین، لاہور، ۱۹۷۰، ص ۱۶۲-۱۷۶ میں شامل ہے، لیکن دوسری اشاعت: بک ٹاک لاہور ۱۹۹۱ سے یہ مقالہ خود ہی نکال دیا ہے، ('عرض مصنف' تاریخی مقالات، طبع دوم) بعض اشعار کی وہ درست قرأت نہیں کر سکے ہیں۔ جیسے ''اگر پرسی زقدّش، سرو باغ راستان آمد'' کو ''اگر برسی زقدس، سرو باغ راستان آمد'' پڑھا اور لکھا ہے، (ص ۱۶۸)

نسخۂ ڈھاکہ (قبل از ۱۰۸۳ھ): ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلادیش کے مرکزی کتب خانے کے شعبۂ مخطوطات (شمارہ ۲۸۶) کا یہ نسخہ بلا تاریخ ہے لیکن اس پر ثبت ایک مہر کی تاریخ ۱۰۸۳ھ ہے جس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ نسخہ اس تاریخ سے پہلے ہی کتابت ہوا ہوگا۔ نسخہ ۱۹۸ ورق پر مشتمل ہے اور خوشخط نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔ سرخ اور سیاہ جدولیں بنی ہوئی ہیں۔ بعض جگہ سے کرم خوردہ ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے فہرست نویس اے بی ایم حبیب اللہ نے اسے متعارف کیا ہے (حبیب اللہ، ج ۱، ص ۲۹۳) اور راجشاہی یونیورسٹی میں شعبہ اردو و فارسی کے استاد ڈاکٹر کلیم سہسرامی نے اسی نسخے کے تعارف پر ایک مضمون لکھا اور مختصر انتخاب کلام بھی دیا، (کلیم سہسرامی، ص ۱۹۷-۲۰۴) ہمیں اس نسخے کے بعض اوراق کی تصاویر بوساطت ڈاکٹر ابوالکلام سرکار صدر شعبۂ فارسی ڈھاکا یونیورسٹی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، قطعات تاریخ کے حصے میں کاتب نے مادہ ہائے تاریخ کو سرخ روشنائی سے لکھا ہے۔ ان تصاویر سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخے پر دو مہریں ہیں۔ ایک مہر دیوان کے اختتام پر ہے اس کا سجع سورہ محمد آیۃ: ۳۸ ''وَاللّٰہُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ'' ''۱۰۸۳'' سے لیا گیا ہے۔ دوسری مہر نسخے کے ظہریہ پر ہے اس کی عبارت یہ ہے: ''ابوالفیض میر محمد دایم ۱۲۵۰''، مہر کے نیچے ہاتھ سے تاریخ ۱۲۶۵ بھی درج ہے۔ اس نسخے کے ورق ۳ ب پر صاحبِ دیوان کی وفات کا قطعہ درج ہے:

هو العزیز

آن قطب زمانہ خواجہ ہاشم در کشور ملک خوری شد
تاریخ وصال گفت ہاتف گو: نزد رسول ہاشمی شد

بیکس عاصی

اس قطعے کے قائل 'بیکس عاصی' کا ایک شجرہ نما قطعہ ورق ۱۹۹ پر درج ہے۔ اشعار اگرچہ

بے وزن ہیں لیکن کچھ تاریخی معلومات فراہم کرتے ہیں:

ہست مداح بزرگان بیکس عاصی ز دل	دارد امید صلہ از ہر جناب خوردحال
روح بخش مردہ دلہا از دم عیسی کمال	رہبر راہ طریقت مرشد با علم و حال
شاہ عبیداللہ مرید والد خود شاہ فی الحال	قدوہ محمد اشرف آن را بود والد خوش خصال
اوشرف رایافت از والد کہ مدحش برتر است	نام پاکش خواجہ معصوم است کان بحر کمال
یافت او این نعمت قطب زمانہ، غوث وقت	ہم بود والد کہ نامش بر کمال است دالّ

نسخۂ لندن (۱۰۸۷ھ): یہ نسخہ پہلے انڈیا آفس، لندن میں تھا۔ اب برٹش لائبریری کا حصہ ہے، (شمارہ ۳۰۹۶) اس نسخے کے کاتب شیخ نور محمد ہیں جنھوں نے اسے ''مجموعۂ خواجہ ہاشم'' نام دے کر ایک حصہ ۱۵/ رجب ۱۰۸۷ھ (۱۶۷۶ء) مطابق ۱۹/ جلوس عالمگیری اور دوسرا حصہ ۲/ رمضان ۱۰۸۷ (۱۶۷۶) کو لکھا۔ خطِ نستعلیق میں ۲۸۶ ورق پر مشتمل یہ نسخہ قدرے کرم خوردہ ہے۔ ایتھے نے اس نسخے کے مندرجات کو جزئیات کے ساتھ متعارف کیا ہے، یہاں تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔ (ایتھے، ج ۲، ص ۱۵۷۰-۱۵۷۲ [شمارہ ۲۸۹۸]؛ غلام مصطفی خان، ص ۳۱-۳۳ کے پیش نظر اسی نسخے کا عکس تھا جس کی مدد سے انھوں نے اس کا مختصر تعارف لکھا اور کچھ نمونۂ کلام بھی دیا۔)

نسخۂ ملا فیروز ممبئی (۱۱۵۸ھ): یہ نسخہ کتب خانہ ملا فیروز، بمبئی (ممبئی) میں ہے (شمارہ VII.67) عہد محمد شاہی میں ۲۷ صفر ۱۱۵۸ھ کو بمقام سورت کتابت ہوا۔ خط واضح لیکن زیادہ محتاط نہیں ہے۔ فیروزی اور سرخ جدولیں بنا کر دو کالم میں کتابت کیا گیا ہے۔ چمڑے کی عمدہ جلد میں مجلد ہے۔ کہیں کہیں سے کرم خوردہ ہے۔ کتب خانے کے فہرست نگار رہتسک نے اس کے مشمولات کی کچھ تفصیل دی ہے۔ (رہتسک، ص ۱۴۴-۱۴۵)

نسخۂ لاہور (۱۲۴۱ھ): یہ نسخہ عجائب گھر، لاہور (قدیم نمبر Acc.No.62 موجودہ نمبر 34) میں ہے۔ عجائب گھر کے تعارف مخطوطات میں اسے خواجہ محمد ہاشم کشمی کے کلام کا ''کلیات ہاشم شاہ [کذا]'' کہا گیا ہے۔ (انجم رحمانی، ص ۲۶؛ احمد منزوی نے اسے نامعلوم ''ہاشم'' شاعر کا 'دیوان ہاشم' لکھا ہے، ج ۸، ص ۱۴۶۳ اور تاریخ کتابت درج نہیں کی۔ روزینہ انجم نقوی نے غزلیات محمد ہاشم کشمی پر کام کرتے ہوئے نسخۂ لندن کے ساتھ ساتھ، اس نسخے کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ روزینہ انجم

نقوی،ص ۵۶،۱۱ ۳)۔ ہمیں خود اصل نسخہ تو نہیں، البتہ اس کی تصویریں دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ ہم لاہور میں شارق خان صاحب کے ممنونِ احسان ہیں کہ ان کی مسلسل کوشش اور تعاقب سے اس نسخے کی تصویری نقل فراہم ہوسکی۔ مخطوطات میں عام طور پر ظہریے، حاشیے یا ترقیمے میں یادداشتیں لکھی جاتی ہیں، لیکن نسخۂ لاہور کے کاتب نے اس روش کے خلاف، مختلف مقامات پر دو کالموں کے درمیان خالی تنگ جگہ پر ترچھے انداز میں کئی یادداشتیں لکھی ہیں جو کاتب اور اس کے خاندان کے حوالے سے بہت اہم ہیں۔ ہم یہ تمام یادداشتیں بترتیب اوراق درج کرتے ہیں:

ورق ۱۹۹ب، ورق ۲۰۰الف، ۲۰۰ب: اعلیٰ حضرت حاجی الحرمین شاہ محمد شریف جدّ بزرگوارم، ہم مانند آبا و اجدادش در مسجد نبوی تا چہل سال تمام درس دادہ و بعد/ حسب الامر پیامبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بمعیت محمد معصوم شاہ کہ عم زادش و پدر مادرم بود، بہ ہند در سال یک ہزار یک صد/ و پنجاہ و دو برای تبلیغ دین حق وارد شد و بہ حلقۂ ارادت حضرت بخت جمال جھنگی درآمد و در جگدیو کلاں درامرت سرسکنی گزید۔

ترجمہ: میرے دادا بزرگوار اعلی حضرت حاجی الحرمین شاہ محمد شریف بھی اپنے باپ دادا کی طرح چالیس سال تک مسجد نبوی میں درس دیتے رہے۔ پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے، اپنے چچازاد محمد معصوم شاہ، جو میرے نانا ہیں، کے ساتھ ۱۲۵۲ میں دین حق کی تبلیغ کے لیے ہندوستان میں داخل ہوئے اور حضرت بخت جمال جھنگی کے مرید ہوکر جگدیو کلاں امرتسر میں سکونت اختیار کی۔

ورق ۲۰۲الف: تحریر نمود محمد شاہ عفی عنہ بتاریخ دوئم شہر ذی حجہ سنہ یک ہزار دو صد چہل و یک از ہجرت۔

ترجمہ: تحریر کیا محمد شاہ نے، اس پر بخشش ہو، بتاریخ ۲ ماہ ذی حجہ، سال ۱۲۴۱ ہجری۔

ورق ۲۰۲ب: جد بزرگوام حضرت حاجی الحرمین در یک ہزار یک صد و شصت و ہفت چون واصل بہ حق شد، درآن زمان پدرم نوزدہ سال از عمرش گذشتہ بود۔

ترجمہ: جب میرے دادا بزرگوار حضرت حاجی الحرمین ۱۱۶۷ میں واصل بحق ہوئے تو اُس وقت میرے والد کی عمر انیس سال تھی۔

ورق ۲۷۸ب، ورق ۲۷۹الف: ولادت والد خود حضرت محمد ہاشم شاہ روز بست و دوم رجب سنہ یک ہزار و یک صد و چہل و ہشت از ہجرت/ وفات در سال یک ہزار دو صد پنجاہ و نو، روز جمعہ

الوداع بست و ششم رمضان المبارک۔

ترجمہ: میرے والد حضرت محمد ہاشم شاہ کی ولادت ۲۲ رجب ۱۱۴۸ ہجری، وفات بروز جمعۃ الوداع ۲۶ رمضان المبارک ۱۲۵۹۔

مذکورہ یادداشتوں اور نسخۂ لاہور کا کاتب محمد شاہ، پنجابی کے معروف شاعر محمد ہاشم معروف بہ ہاشم شاہ (۲۲ رجب ۱۱۴۸۔۲۶ رمضان ۱۲۵۹/۱۸۴۳۔۱۷۳۵ء) کا بیٹا اور حاجی محمد شریف (م: ۲۳ ذی الحجہ ۱۱۶۷/۱۷۵۴ء) کا پوتا ہے۔ حاجی محمد شریف سلسلۂ نوشاہیہ میں خواجہ بخت جمال جھنگی والا (م: ۷ رجب ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۱ء) کے مرید تھے۔ ہاشم شاہ جگدیو ضلع امرت سر میں پیدا ہوئے اور تھر پال ضلع نارووال میں دفن ہیں۔ وہ اپنے والد کے مرید تھے۔ ہاشم شاہ کے دو بیٹے تھے جن میں ایک کا نام پیر شاہ عرف محمد شاہ تھا جو ہمارے نسخے کا کاتب ہے۔ محمد شاہ نے نسخے پر اپنے والد کی تاریخ وفات ۲۶ رمضان ۱۲۵۹ لکھی ہے، جسے روزینہ انجم نقوی نے معلوم نہیں کیوں ۲۶ رمضان ۱۰۵۹ پڑھا ہے؟ حالانکہ تاریخ حروف میں ہے اعداد میں نہیں کہ مغالطہ ہو۔ نیز ڈاکٹر روزینہ نے اسے محمد ہاشم کشمی کی تاریخ وفات بتایا ہے جو قطعاً غلط ہے۔ محمد اقبال مجددی نے اسے درست طور پر ۱۲۵۹ پڑھا ہے اور اسے 'کسی اور' محمد ہاشم کی تاریخ وفات بتایا ہے۔ یہ 'کوئی اور' محمد ہاشم دراصل پنجابی کے معروف اور صف اوّل کے شاعر اور حضرت نوشہ گنج بخش قادری (۹۵۹۔۱۰۶۴ھ) کے فارسی ملفوظات چہار بہار کے مرتّب ہیں۔ سید شریف احمد شرافت نوشاہی (۱۹۰۷۔۱۹۸۳ء) نے شریف التواریخ جلد سوم کے حصہ دوم میں خواجہ بخت جمال جھنگی والا، حصہ سوم میں حاجی محمد شریف اور حصہ چہارم میں محمد ہاشم جگدیوی کے حالات بتفصیل لکھے ہیں اور اپنے اپنے مقام پر محمد شاہ کی ان یادداشتوں سے مستفاد ہونے والی اطلاعات کا اندراج کیا ہے۔ اگر انھوں نے خود یہ نسخہ نہیں دیکھا تو بالواسطہ کسی ماخذ (غالباً تذکرۂ ہاشمیہ تصنیف ماسٹر غلام نبی) سے یہ اطلاعات لی ہیں۔ (شریف احمد شرافت نوشاہی، جلد سوم، حصہ سوم، ص ۲۲۸؛ جلد سوم، حصہ چہارم، ص ۲۱۸۔۲۱۹) یہ محض ہمارا ایک قیاس ہوسکتا ہے کہ نسخۂ لاہور کے کاتب محمد شاہ نے مغالطے میں دیوان محمد ہاشم کشمی کو اپنے والد محمد ہاشم متخلص بہ ہاشم کا دیوان سمجھ کر کتابت کیا ہو اور اسی وجہ سے نسخے پر اپنے والد کی تاریخ وفات اور اپنے دادا کے مختصر حالات لکھے ہیں۔

(جاری)

طبقات ابن سعد کا ایک ورق

☆کلیم صفات اصلاحی

مشہور آسمانی کتابوں میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ موجود ہے۔آپ ؐ کا نام، جائے پیدائش، ذریت، نسل اور آپ ؐ کے اوصاف وکمالات بشارتوں اور پیشین گوئیوں کی شکل میں ان صحف سماوی کا حصّہ ہیں۔جو لوگ توریت، زبور اور انجیل سے واقف اور ان کتابوں کو ماقبل اسلام پڑھتے پڑھاتے تھے بالخصوص یہود ونصاری انہیں بخوبی علم تھا کہ نبیِّ برحق کی آمد آمد ہے۔انہیں یقین تھا کہ اس نبی کی بعثت جب بھی ہوگی ان کی ہی قوم میں ہوگی لیکن جب آپ ؐ بنو اسماعیل میں مکہ کے قبیلۂ قریش میں مبعوث ہوئے اور اس کی اطلاع انہیں ملی تو خوشی کے بجائے انہیں صدمہ ہوا۔چونکہ وہ نبوت کو اپنے خاندان کی میراث، اس عزت وناموس پر اپنا اجارہ اور اسی کی بدولت دوسری قوموں کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے۔اس لیے انہیں برداشت نہیں ہوا اور انہوں نے نہ صرف یہ کہ کتمانِ علم وشہادت جیسے جرم کا ارتکاب کیا بلکہ آپ ؐ کے خلاف معاندانہ روش اختیار کی اور ان کتابوں سے ایسی شہادتیں مٹانے پر آمادہ ہوگئے جن میں آپ ؐ کا ذکر خیر تھا۔خوش بختی سے بعض صالح الفطرت یہود ان شہادتوں کو پڑھ کر حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو انہوں نے اپنے گھر کی ان سازشوں کا پردہ فاش کیا اور بعد میں قرآن نے تو ان کی اس قسم کی علمی خیانتوں توریت وغیرہ میں تحریف وتبدل کا ان کا جرم ہی فاش کردیا۔زیر نظر مضمون میں طبقات ابن سعد کے اس سلسلہ کے ایک باب کا مطالعہ پیش خدمت ہے۔

طبقات ابن سعد کا شمار سیرت کے اہم، مشہور اور مستند مصادر میں ہوتا ہے۔اس کی ابتدائی دو جلدیں خاص سیرت نبوی ؐ سے متعلق ہیں۔ان میں سیرت کے تقریباً تمام اہم نقوش اور پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔مولانا شبلی ؒ نے مقدمۂ سیرۃ النبی ؐ میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ

☆رفیق دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

''ابن سعدؒ نے آنحضرتؐ اور صحابہؓ کے حالات میں ایسی جامع اور مفصل کتاب لکھی ہے کہ جس کا جواب آج تک نہ ہو سکا۔''(۱) اس کے جزء اول کے قسم ثانی میں ابن سعد نے ایک باب ''ذکر صفۃ رسول اللہ صلعم فی التوراۃ و الانجیل ''یعنی تورات و انجیل میں آنحضورؐ کے صفات حسنہ کا ذکر کے عنوان سے باندھا ہے۔اس میں کل ۱۲؍روایتیں ہیں اور تقریباً ہر روایت بہ سند نقل کی ہے۔خاص بات یہ ہے کہ ان روایتوں کے آخر کے راویوں میں بیشتر ایسے ہیں جن کو یا تو براہ راست توریت و انجیل کا علم تھا اور صحف سماوی ان کے مطالعہ میں رہتے تھے یا پھر وہ اہل کتاب صحابہؓ ہیں جن کو ان کے طلب صادق کے نتیجہ میں اسلام کی نعمت نصیب ہوئی۔اس کا اندازہ خود روایتوں کے اسلوب و انداز سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان میں سے بعض نے آسمانی کتابوں کے اپنے علم و مطالعہ کی کیفیت بیان کردی ہے۔اخیر کے راوی جن سے یہ روایتیں مروی ہیں ابن عباسؓ، ابوصالحؒ، کعب الاحبارؒ، عبداللہ بن سلامؓ، زید بن اسلمؒ، زہریؒ، عطاء بن یسارؒ، کثیر بن مرّہؒ، قتادہؒ، عیزارؒ بن حریث ہیں اور آخری روایت سہل مولائے عتیبہ سے ہے۔راویوں کی مذکورہ فہرست سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں ممتاز صحابہؓ و تابعینؒ اور نامور محدثین شامل ہیں۔یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان روایتوں میں آپؐ کے متعلق کتب سماوی کے حوالہ سے جو صفتیں بیان ہوئی ہیں ان میں ایک صفت بھی ایسی نہیں ہے جس سے آپؐ متصف نہ ہوں۔ابن سعد کے اس خاص اور اہم حصہ کے لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس کا ایک مطالعہ پیش کیا جائے۔ان روایتوں سے جہاں ایک طرف توریت و انجیل میں آپؐ کے ذاتی و اخلاقی اوصاف و کمالات کا علم ہوتا ہے وہیں ان اہل کتاب نے جس طرح رسول کریمؐ کو آزمائشوں میں ڈالا اور آپؐ کی استقامت دیکھ کر انھوں نے قبول اسلام کیا، اس کا بھی پتہ چلتا ہے۔ابن سعد نے اس ضمن میں جو روایتیں نقل کی ہیں ان میں بیشتر ایسی ہیں جن کی تائید تفسیر و سیر و احادیث کی دیگر کتابوں سے ہوتی ہے اور یہ ذکر صحابہ پر مشتمل کتابوں مثلاً نظم الدرفی تناسب الآیات والسور، اصابہ، اسد الغابہ، مسند ابن حنبل اور المستدرک للحاکم وغیرہ میں بھی موجود ہیں۔اس لیے ان روایتوں کی تخریج پر زور نہیں دیا گیا ہے۔البتہ واقعات میں جہاں کہیں ابہام ہے اس کو یا تو بین السطور یا پھر حاشیہ میں دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔روایات ابن سعد ملاحظہ فرمائیں۔

پہلی روایت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے کعب الاحبار☆ سے پوچھا کہ توریت

میں آپ رسول اللہ کی کیسی تعریف پاتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ ہم پاتے ہیں کہ (آپ کا نام) محمد بن عبداللہ، آپ کا مولد مکہ ہوگا۔ آپ کی ہجرت طابہ (کھجوروں کے باغ یعنی مدینہ) کی طرف ہوگی۔ آپ کا اقتدار شام میں ہوگا۔ آپ فحش گو، بازاروں میں آوارہ گردی یا شور شرابہ کرنے والے اور برائی کا بدلہ برائی سے لینے والے نہ ہوں گے۔ عفو و درگذر کرنے والے ہوں گے۔ نجدہ محمد بن عبداللہ مولدہ بمکۃ ومھاجرہ الیٰ طابۃ ویکون ملکہ بالشام لیس بفاحش ولا بصخّاب فی الاسواق ولا یکافئی بالسیئۃ ولکن یعفو ویغفرہ۔ (۲)

دوسری روایت ابوصالح ☆☆ سے مروی ہے کہ کعب نے کہا کہ توریت میں آپ کی صفت ہے کہ محمد میرے پسندیدہ بندہ ہیں، نہ بدخلق ہیں، نہ سخت کلام ہیں، نہ بازاروں میں شوروغل کرنے والے، نہ برائی کا بدلہ برائی سے دینے والے بلکہ معاف کرنے والے ہیں۔ جائے پیدائش مکہ، جائے

☆ کعب الاحبار، مشہور تابعی اور یہودیت کے بڑے عالم تھے۔ یہودیت ان کا آبائی مذہب تھا۔ قبول اسلام سے پہلے اپنے مذہب کے علمائے کبار میں شمار ہوتے تھے، وسعت علم و مطالعہ کے سبب ان کو کعب احبار کہا جاتا تھا۔ صحیح ترین روایت کے مطابق حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے جن سے یہ روایت مروی ہے ان سے پوچھا کہ عہد نبویؐ و خلافت ابوبکرؓ کے زمانہ میں اسلام قبول کرنے سے کیا چیز حارج تھی۔ بولے کہ میرے والد نے مجھ کو توریت سے ایک تحریر لکھ کر دی تھی اور کہا تھا اس پر عمل کرنا، دوسری تمام مذہبی کتابوں پر مہر لگا کر وعدہ لیا تھا کہ اس کو نہ توڑنا۔ اب جبکہ میں نے دیکھا کہ اسلام کو غلبہ حاصل ہوگیا ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں دیکھ رہا ہوں۔ دل میں خیال آیا کہ والد نے تجھ سے کچھ چھپایا ہے کاش تم اس کو پڑھتے۔ میں نے مہر توڑ ڈالی اور پڑھا تو اس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت کی صفت پائی اور آکر اسلام قبول کرلیا۔ قالت لی نفسی لعل اباك غیب عنك علما كتمك فلو قرأته ففضضت الخاتم فوجدت فیه صفة محمد و امته فجئت الآن مسلما۔ ابن سعد جزء، ۷ قسم ثانی ص ۱۵۶۔

☆☆ غالباً یہ وہی ابوصالح تابعی ہیں جن کا نام ابن سعد کے مطابق ذکوان ہے۔ غطفان کے مولی تھے۔ عبداللہ بن دینار، قعقاع بن حکیم اور سلیمان الاعمش وغیرہ نے ان سے روایت کی ہے۔ ثقہ اور کثیر الحدیث تھے۔ ان کا قول ہے کہ ایسا کوئی شخص نہیں جو ابوہریرہؓ سے حدیث بیان کرتا ہو اور میں اسے نہ جانتا ہوں کہ وہ صادق ہے یا کاذب؛ ابن سعد ج ۸ ص ۳۴۹، ۳۵۰۔

ہجرت مدینہ اور ان کی حکومت شام میں ہوگی۔

تیسری روایت ابوعبداللہ الجدلی سے بعینہٖ ان ہی الفاظ کے ساتھ مروی ہے، البتہ اس میں آخر کا حصہ یعنی جائے پیدایش سے اقتدار تک مذکور نہیں ہے۔

چوتھی روایت زید بن اسلم سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم تک یہ بات پہنچی کہ عبداللہ بن سلام☆ کہا کرتے تھے کہ توریت میں آنحضورؐ کے بارے میں بیان ہے کہ اے نبیؐ! ہم نے آپؐ کو شاہد (گواہ) مبشر (خوش خبری دینے والا) نذیر (ڈرانے یا چوکنّا کرنے والا) امّیوں کا محافظ بنا کر بھیجا ہے۔ آپؐ میرے بندے اور رسولؐ ہیں۔ میں نے آپؐ کا نام متوکل (اللہ پر بھروسہ کرنے

☆ان کا پرانا نام حصین تھا۔ قبول اسلام کے بعد آنحضورؐ نے ان کا نام عبداللہ رکھا۔ یہود بنی قینقاع سے ان کا تعلق تھا۔ توریت وانجیل کے زبردست عالم تھے۔ اسلام کے بعد ان کا میلان قرآن وحدیث کی جانب بڑھا تو اس میں اس قدر درک حاصل کیا کہ لوگ ان سے شرعی مسایل میں فتویٰ پوچھتے تھے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ نے مرض الموت کے وقت وصیت میں ان کے متعلق آنحضورؐ کی یہ حدیث بیان کی کہ انہوں نے آپؐ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ دسویں جنتی ہیں۔ کان یھودیا ثم اسلم فانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول انہ عاشر عشرۃ فی الجنۃ۔ (مسند احمد جلد ۵، ص ۲۴۳، مطبع میمنیہ، مصر ۱۳۱۳ھ/ ۱۸۹۵ء)۔ صحیح بخاری میں ان کے قبول اسلام کے متعلق جو تفصیل نقل ہوئی ہے اس کے مطابق جب آپؐ مدینہ تشریف لائے تو عبداللہ بن سلامؓ کو خبر ہوئی، وہ بچوں کے ساتھ پھل چننے باغ میں گئے ہوئے تھے، خدمت اقدس میں حاضر ہوکر کہا کہ آپؐ سے تین باتیں پوچھتا ہوں جو نبیوں کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم ہیں۔ آپؐ نے ان کا جواب دے دیا تو فوراً کلمۂ شہادت پڑھ لیا۔ اس کے بعد کہا کہ یہود افترا پرداز قوم ہے اور میں عالم بن عالم اور رئیس بن رئیس ہوں۔ آپؐ میرے متعلق ان سے معلوم کر لیجیے مگر میرے اسلام کی انہیں خبر نہ ہو، آپؐ نے یہود کو بلا کر ان کے سامنے دعوت پیش کی اور فرمایا عبداللہ بن سلام کون ہیں؟ کہا، ہمارے سردار ہیں۔ فرمایا، وہ اسلام قبول کر سکتے ہیں؟ انہوں نے کہا، کبھی نہیں۔ آنحضرتؐ نے انہیں آواز دی تو کلمہ پڑھتے ہوئے باہر نکلے اور یہود کو مخاطب کر کے کہا۔ خدا سے ڈرو! تمہیں خوب معلوم ہے کہ یہ رسول ہیں۔ ان کا مذہب سچا ہے۔ اس کے باوجود تم ان پر ایمان نہیں لاتے۔ یہود نے کہا کہ تم جھوٹے ہو اور ہماری قوم کے بدترین شخص ہو۔ تمہارا باپ بھی بدترین شخص تھا۔ پھر آپؐ سے عبداللہ بن سلامؓ نے کہا کہ دیکھا۔ مجھے اسی کا ڈر تھا۔ قال ھٰذا کنت اخاف یا رسول اللہ۔ (بخاری میں باب بنیان الکعبۃ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

والا) رکھا ہے۔ نہ تو وہ بدخلق ہیں، نہ سخت کلام، نہ بازاروں میں شور کرنے والے، نہ برائی کا بدلہ برائی سے دینے والے، معاف کرنے والے ہیں۔ ''نہ تو بدخلق سے معاف کرنے والے تک'' کے ہو بہو الفاظ گذشتہ روایتوں میں گذر چکے ہیں) میں انہیں اس وقت تک نہ اٹھاؤں گا جب تک ٹیڑھی ہو جانے والی ملت کو سیدھا نہ کر دوں (یعنی گمراہوں کو راہ راست پر نہ لا دوں) بایں طور کہ لوگ کلمۂ توحید کا اقرار نہ کر لیں۔ (اللہ) ان ہی (یعنی رسولؐ) کے ذریعہ نابینا آنکھوں، بہرے کانوں اور دلوں پر چڑھے ہوئے غلاف کو کھولے گا۔ ولن اقبضه حتٰی اقیم به الملة المتعوجة بأن یقولوا لا اله الا الله فیفتح به اعینا عمیا وآذانا سمعا وقلوبا غلفا۔ جب یہ بات کعب کو معلوم ہوئی تو انہوں نے کہا کہ عبداللہ بن سلامؓ نے سچ کہا۔ البتہ انہوں نے فیفتح به کے بعد بلسانهم اعینا عمومیین وآذانا صمو میین وقلوبا غلوفیین کے الفاظ کہے۔(۳)

پانچویں روایت میں جریر بن حازم کہتے ہیں کہ مجھ سے اس شخص☆ نے بیان کیا جس نے زہری کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ایک یہودی☆☆ نے کہا کہ توریت میں کوئی صفت رسولؐ ایسی نہ تھی جو میں نے نہ دیکھ لی ہو سوائے حلم کے۔ میں نے اسی حلم کی آزمائش کے لیے تیس دینار آپؐ کو ایک مقررہ وقت کے لیے بطور قرض دیے تھے۔ مدت پوری ہونے میں ایک دن باقی تھا کہ میں آپؐ کے پاس گیا اور کہا۔ اے محمدؐ! مجھے میرا حق دیجیے یا محمد اقض حقی۔ (یعنی میرا قرض واپس کیجیے) اے گروہ بنی عبدالمطلب! آپ لوگوں کی (بہانہ بازیاں اور) ٹال مٹول بہت بڑھ گئی ہے۔ تو عمرؓ نے کہا۔ اے یہودی!

سابقہ حاشیہ: کے تحت باب هجرة النبی ﷺ واصحابه الی المدینة ومقدم النبی ﷺ واصحابه الی المدینة، جلد ۱ ص ۵۵۶ و ۵۶۱، مطبوعہ دیوبند میں یہ روایت مفصلاً ذکر کی گئی ہے۔ یہاں ان دونوں ابواب کا خلاصہ نقل کیا گیا ہے)۔ اس حدیث میں عبداللہ بن سلامؓ نے اپنی قوم کے لیے لفظ ''بہتٌ'' استعمال کیا ہے۔ اس سے ان کی قوم یعنی یہودیوں کی افترا پردازیوں اور بہتان و تہمت طرازیوں کا بھی علم ہوتا ہے۔

☆اس شخص کی تحقیق نہیں ہو پائی۔ چونکہ یہ روایت بسند مستدرک حاکم میں موجود ہے اس لیے اس کی تحقیق و تخریج کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ ☆☆اس واقعہ میں زہری نے جس یہودی کی جانب اشارہ کیا ہے وہ زیدؓ بن سعنہ ہیں۔ ان کا شمار یہودی علما میں ہوتا ہے۔ ان کے قبول اسلام کے متعلق مستدرک حاکم نے بھی یہی روایت بہ سند نقل کی ہے۔ البتہ تفصیل میں معمولی اختلاف ہے۔ مثلاً مستدرک حاکم میں ہے کہ ابن سعنہؓ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اگر آپؐ نہ ہوتے تو میں اس جگہ مارتا جہاں تیری دونوں آنکھیں ہیں (یعنی تیرا سر پھوڑ ڈالتا)۔رسول اللہؐ نے فرمایا! اے ابوحفص! (عمرؓ) اللہ تمہاری مغفرت کرے۔ہم دونوں کو اس (سخت گفتگو) کے بجائے تم سے اس معاملہ میں اس بات کی زیادہ توقع تھی کہ تم مجھ کو اس کا حق لوٹانے (یعنی قرض ادا کرنے) کا مشورہ دیتے جو مجھ پر واجب تھا۔وہ (یہودی) اس کا زیادہ محتاج و مستحق تھا کہ تم اس کا حق وصول کرنے میں اس کی مدد کرتے۔یہودی کہتا ہے کہ میری سختی اور جہل نے آپؐ کے حلم میں اضافہ ہی کیا۔آپؐ نے فرمایا! اے یہودی تیرے حق کا وقت توکل ہوگا؟ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا! اے ابوحفص! اس کو اس باغ میں لے جاؤ جو اس نے پہلے روز مانگا تھا۔اگر یہ راضی ہو جائے تو اس کو اتنے اتنے صاع دے دو اور جو کچھ تم نے اس کو کہا ہے (یعنی اس سے تم نے جو تلخ کلامی کی ہے) اس کے سبب اتنے اتنے صاع اور دے دو۔اگر اس پر راضی نہ ہو تو کسی بھی باغ سے دے دو۔وہ کھجور پر راضی ہو گیا تو (حضرت) عمرؓ نے آنحضورؐ کی ہدایت کے مطابق اس کو کھجوریں دے دیں اور اتنا زیادہ بھی دیا جتنا آپؐ نے حکم دیا تھا۔یہودی نے کھجوروں پر قبضہ کے بعد کہا ”اشھد ان لاالہ الااللہ وانہ رسول اللہ“۔اے عمرؓ! آپ نے ابھی جو کچھ دیکھا ہے مجھے اس پر اس چیز نے آمادہ کیا کہ میں نے آپ کی وہ تمام صفتیں آپ میں دیکھ لی تھیں جو توریت میں بیان کی گئی ہیں،صرف آپؐ کا حلم باقی تھا،آج میں نے وہ بھی آزما لیا۔میں نے آپؐ کو توریت کی بیان کردہ خوبیوں کے مطابق پایا۔میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ یہ کھجور اور میرے مال کا نصف حصہ تمام فقرائے اسلام اور ضرورت مندوں پر صرف ہوگا۔عمرؓ نے کہا کہ یا بعض فقرا پر،تو اس نے کہا کہ یا بعض فقرا پر۔اس یہودی کے تمام اہل خانہ مشرف بہ اسلام ہو گئے۔سوائے ایک صد سالہ بڈھے کے۔

سابقہ حاشیہ: نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ اے عمرؓ! تم مجھ کو پہچانتے ہو؟ انہوں نے کہا،نہیں۔تم کون ہو؟ میں نے کہا، میں زید بن سعنہ ہوں۔عمرؓ نے حیرت سے کہا کہ وہ زید جو الحبر (یعنی مشہور عالم) ہیں؟ میں نے کہا،ہاں!۔ابن سعد کی روایت میں یہ جملہ نہیں ہے۔ابن سعد میں یہ بھی ہے کہ وہ اپنے تمام اہل خانہ کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوئے۔سوائے ایک صد سالہ بوڑھے کے۔مستدرک حاکم کی روایت میں ہے کہ وہ ایمان لائے،آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی،ان کے ساتھ ایک جم غفیر موجود تھا۔وبایعہ وشھد معہ مشاھد کثیرۃ۔ ذکر اسلام زید بن سعنہ۔ جلد۳،ص ۶۰۵۔دائرۃ المعارف النظامیہ،حیدر آباد،۱۳۴۱ھ۔

وہ اپنے کفر (یعنی اپنے مذہب) پر قائم رہا۔ واسلم اهل بيت اليهودي كلهم الا شيخا كان ابن مئة سنة فعسا على الكفر ۔(۴)

چھٹی روایت عطا بن یسار سے مروی ہے کہ عبداللہ بن عمرو العاصؓ سے توریت میں بیان کردہ آپؐ کی خوبیوں کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ واللہ توریت میں آپؐ کی وہی صفت بیان کی گئی ہے جو قرآن میں ہے۔ يا ايها النبی انا ارسلناك شاهدا و مبشرا ونذيرا ۔ توریت میں بھی یہی ہے۔ اس کے بعد وہی الفاظ ہیں جو مذکورہ بالا روایت عبداللہ بن سلامؓ میں ہیں۔ عطا کہتے ہیں کہ میں کعب سے ملا تو انہوں نے بھی یہی روایت بیان کی سوائے اس کے کہ ان کے الفاظ بدلے ہوئے تھے۔ مگر اس کے معانی یہی تھے۔

ساتویں روایت کثیر بن مرّہ سے ہے کہ اللہ فرماتا ہے کہ تمہارے پاس ایسے رسول آ گئے ہیں جو نہ کاہن ہیں اور نہ سست۔ اس کے بعد وہی الفاظ ہیں جو چھٹی روایت کے آخر میں ہیں۔

آٹھویں روایت حضرت قتادہ سے مروی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ بعض آسمانی کتابوں میں ہے کہ محمد رسولؐ اللہ نہ تو بد خلق ہوں گے۔ نہ سخت کلام، اس کے بعد وہی الفاظ ہیں جو مذکورہ بالا بیشتر روایتوں میں وارد ہیں البتہ اس روایت کے آخر میں یہ اضافہ ہے کہ آپؐ کی امت ہر حال میں حمد و شکر کرنے والی ہوگی۔ امتهٔ الحمّادون علی کلّ حالٍ ۔(۵)

نویں روایت میں ہے کہ مجاہد ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ "فاسئلوا اهل الذکر" ☆ میں خطاب مشرکین قریش سے ہے کہ تم یہود و نصاریٰ سے پوچھ لو کہ رسول اللہ کا ذکر توریت و انجیل میں ہے کہ نہیں۔

دسویں روایت ابن سعد نے یہ نقل کی ہے کہ ان الذين يكتمون ما انزلنا من البينات والهدى ...... الخ کی تفسیر میں قتادہ کہتے ہیں کہ یہ یہود ہیں جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چھپایا

☆ آیت کا یہ ٹکڑا سورہ نحل ۱۶ آیت نمبر ۴۳ اور سورہ انبیا ۲۱ کی آیت نمبر ۷ کا جز ہے۔ یہاں خطاب مشرکین مکہ سے ہے اور اہل الذکر سے مراد یقیناً اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ ہیں لیکن اس میں حضرت ابن عباسؓ کا یہ کہنا کہ ان سے یہ پوچھ لو کہ آپؐ کا ذکر توریت و انجیل میں آیا ہے کہ نہیں؟۔ آیت کا سیاق و سباق اس خاص معنیٰ کی تائید نہیں کرتا۔ اس میں دراصل اہل مکہ جو معترض تھے کہ ان کے پاس خدا کا یہ پیغام ہمارے ہی اندر کا آدمی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حالانکہ وہ انہیں توریت وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔انہوں نے ''ویلعنھم اللاعنون'' کے متعلق کہا کہ ان پر لعنت کرنے والے ملائکہ اور مؤمنین ہیں۔

گیارہویں روایت عیزار بن حویرث سے مروی ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق انجیل میں لکھا ہے کہ نہ بد خلق ہوں گے، نہ سخت کلام، یہ اور اس کے بعد وہی الفاظ ہیں جو مذکورہ بالا بیشتر روایتوں میں ہیں کہ آپؐ بازاروں میں لغویات یا بکواس کرنے والے اور برائی کا بدلہ برائی سے دینے والے نہ ہوں گے بلکہ عفو و درگذر سے کام لینے والے ہوں گے۔(۶)

بارہویں یا آخری روایت سہل مولائے عتیبہ☆ سے مروی ہے کہ وہ اہل مریس کے نصرانی (عیسائی) تھے، یتیم ہو گئے۔ والدہ اور چچا کی نگرانی میں پرورش پائی۔انجیل پڑھا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے چچا کا نسخہ انجیل لیا اور اسے پڑھا۔ جب میری نگاہ سے ایک ورق گذرا تو اس کی کتابت مجھے عجیب لگی۔اس کو چھوا تو دیکھا کہ اس ورق کا کچھ حصہ چپکا ہوا ہے۔ چاک کیا تو اس میں آپؐ کی تعریف پائی کہ نہ تو آپؐ کوتہ اندام ہوں گے، نہ طویل قامت، گورے ہوں گے کاکلوں والے، دونوں کاندھوں کے درمیان مہر ہوگی۔زیادہ تر زانو سمیٹ کر بیٹھیں گے۔صدقہ قبول نہ کریں گے۔خچر

سابقہ حاشیہ: کیوں لے کر آیا ہے۔؟ فرشتے کیوں نہیں لے کر آئے؟ اس اعتراض پر اللہ نے نبیؐ سے فرمایا کہ ان سے کہہ دیجئے کہ اہل ذکر یعنی یہود و نصاریٰ جن کو بارہا اس کا تجربہ ہو چکا ہے ان سے پوچھ لیں کہ اس سے پہلے ہم نے آدمیوں کو ہی رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اللہ کا پیغام وہی ان کے پاس لے کر آتے تھے۔ فرشتے نہیں۔خود زیر بحث آیت ''وما ارسلنا من قبلك الا رجالا نوحی الیھم فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم تعلمون'' (النحل ۱۶: ۴۳ والانبیاء ۲۱: ۷) کے ظاہر الفاظ اسی معنیٰ کو بیان کرتے ہیں۔(دیکھیے تدبر قرآن جلد چہارم ص ۴۱۲ وجلد پنجم، ص ۱۲۶، تاج کمپنی، ترکمان گیٹ دہلی ۱۹۹۷ء و تفہیم القرآن جلد دوم ص ۵۴۲۔ ۵۴۳، ۱۹۷۵ء وجلد سوم ص ۱۴۹، ۱۹۷۳ء) اس لیے اس آیت سے یہ معنیٰ لینا کہ ان سے پوچھ لو کہ توریت وانجیل میں آپؐ کا ذکر آیا ہے کہ نہیں تاویل بعید کے زمرہ میں آتا ہے۔

☆سہل کے متعلق جو تفصیل اس روایت میں ہے۔اس سے صرف ان کے عیسائی یتیم ہونے اور ان کے مطالعۂ انجیل کا حال معلوم ہوتا ہے۔ان کے قبول اسلام کی صراحت اس میں نہیں ہے۔دوسرے مصادر میں بھی ان کا اور حال نہیں ملتا۔ اس روایت کا سلسلۂ سند یہ ہے: اخبرنا محمد بن اسماعیل بن ابی فدیك المدنی عن موسیٰ بن یعقوب الزمعی عن سھل مولیٰ عتیبہ. انہ کان نصرانیا من اھل مریس وانہ کان یتیماً فی حجر امہ وعمہ وانہ کان یقرء الانجیل الخ۔ابن سعد جزء اول قسم ثانی ص ۸۸۔

اور اونٹ ان کی سواری ہوگی۔بکری کا دودھ دوہیں گے،پیوند والا کرتا پہنیں گے۔جو ایسا کرے گا (یعنی جس کے اندر یہ صفتیں ہوں گی)وہ تکبّر سے بری ہوگا۔وہ ایسا کریں گے (یعنی ان کے اندر یہ خوبیاں ہوں گی)،وہ اسماعیل کی ذریّت میں سے ہوں گے۔ان کا نام احمد ہوگا۔سہل کہتے ہیں کہ جب یہاں یعنی ذکر محمدؐ تک پہنچا کہ میرے چچا آ گئے۔جب انہوں نے اس ورق کو دیکھا تو مجھے مارا،کہا کہ اس ورق کو کھولنے اور پڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟میں نے کہا،اس میں نبی احمدؐ کا ذکر ہے تو انہوں نے کہا کہ وہ ابھی نہیں آئے ہیں۔وقال مالك وفتح هٰذه الورقة وقراءته فقلت فيها نعت النبی صلعم احمد فقال انه لم يأت۔(۷)

اسی روایت پر اس باب کا اختتام ہوا ہے۔ابن سعد کا یہ باب اس لحاظ سے اہم اور قابل توجہ ہے کہ اس خاص حصہ سیرت پر دوسری کتب سیر جیسے کتاب المغازی للواقدی،سیرت ابن اسحٰق اور سیرت ابن ہشام میں یکجا اس قدر مفصل روایتیں موجود نہیں ہیں جتنی ابن سعد کے اس باب کے تحت وارد ہیں،البتہ ابن ہشام میں ''صفة رسول الله من الانجيل''(۸) کے نام سے ایک مختصر باب موجود ہے جس کے راوی صرف ابن اسحٰق ہیں یعنی ابن سعد پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس جانب التفات کیا۔

اس سلسلہ میں ابن ہشام نے ابن اسحٰق کی جو روایت نقل کی ہے اس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔چونکہ عبارت بہت بلیغ اور وضاحت طلب ہے اس لیے سیاق وسباق کی رعایت کرتے ہوئے قوسین میں وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

> ''ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ مجھے عیسیٰ بن مریمؑ کے اس موقف کے متعلق جو انہوں نے انجیل میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت کے متعلق اہل انجیل کے سامنے رکھا تھا پتہ چلا اور جس کو یحنّس حواری نے انجیل میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے ان سے آنحضورؐ کی صفت کے سلسلہ میں باقاعدہ عہد لے کر کہا تھا کہ جس نے مجھ کو ناراض کیا اس نے رب (یعنی روح القدس) کو ناراض کیا۔اگر میں نے ان کے سامنے وہ کارنامے (خرقِ عادت) انجام نہ دیے ہوتے جو مجھ سے پہلے کسی نے انجام نہیں دیے(اور یہ لوگ اس وقت میری اس بات یعنی آنحضورؐ کے متعلق جو بتانے والا ہوں نہ مانتے) تو ان کی کوئی غلطی نہ ہوتی۔لیکن اب جب کہ وہ (اس نشہ میں) مغرور اور

سمجھ بیٹھے ہیں کہ ان کو مجھ سے اور رب سے بھی نسبت ہے (یعنی وہ چاہے میری یہ بات مانیں نہ مانیں، ان سے کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا تو یہ ان کی خام خیالی ہے) حالانکہ یہ ضروری ہے کہ وہ کلمہ جو ناموس میں ہے پورا ہو کر رہے گا۔ المنحمنا آئے گا۔ یہ وہی ہوگا جس کو اللہ تمہاری جانب رب روح القدس (جبرئیلؑ) کے واسطے سے بھیجے گا۔ وہ ظاہر ہوگا۔ مجھ پر وہ گواہ ہوگا اور تم بھی۔ (یعنی اس کی آمد کے متعلق میں جو تم کو یہ خبر دے رہا ہوں اس کے تم خود گواہ ہو)۔ اس لیے کہ تم (یعنی تمہاری نسل) پہلے میرے ساتھ اس عہد (میثاق) میں شامل تھے۔ (یعنی ان کی ذمہ داری تھی کہ تم کو نسل درنسل اس میثاق کے متعلق بتاتے لیکن انہوں نے تم کو بتانے کے بجائے چھپایا)۔ دیکھو! میں نے تم (یعنی تمہاری گذشتہ نسل) سے کہہ دیا تھا (یعنی ہوشیار کر دیا تھا اس لیے) تم کو شکوہ نہیں ہونا چاہیے۔"

اس کے بعد جو جملہ ہے وہ "المنحمنا" کی وضاحت ہے۔

"المنحمنا" سریانی میں محمد ہیں، رومی زبان میں فرقلیطس۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔"(۹)

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ صاحب نظم الدرر نے سورہ الصّف کی آیت نمبر ۶، ۷ کی تفسیر ووضاحت کے تحت ابن اسحاق کی یہی روایت نقل کی ہے۔(۱۰)

مراجع

(۱) سیرۃ النبی، علامہ شبلی نعمانی، جلد اول ص ۱۹، معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۲۰۰۳ء۔ (۲) ابن سعد جزء اول قسم ثانی، ص ۸۷، مطبعہ بریل لیڈن، ۱۳۳۸ھ۔ (۳) ابن سعد جز اول، قسم ثانی، ص ۸۷۔ (۴) طبقات ابن سعد جزء اول، قسم ثانی، ص ۸۸۔ (۵) ایضاً، ص ۸۸۔ (۶) ایضاً، ص ۸۹۔ (۷) ایضاً۔ (۸) سیرت ابن ہشام، جلد اول، صفۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الانجیل، ص ۱۴۸، ۱۴۹، مطبع محمد علی صبیح از ہر شریف۔ (۹) ایضاً۔ (۱۰) دیکھیے نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور، سورہ صف آیت نمبر ۵، ۶، جلد ۲۰ ص ۲۷، ابوالحسن برہان الدین ابراہیم بن عمر البقاعی (متوفی ۸۸۵ھ)، ناشر دار الکتب الاسلامی القاہرہ۔

رشید حسن خاں اور ڈاکٹر گیان چند جین

☆ جناب ٹی۔آر۔رینا

(۳)

دونوں شخصیات میں ادبی بے تکلفی ہونے کے باوجود خاں صاحب جین صاحب کے قدر شناس تھے۔اس کا اندازہ آپ خاں صاحب کے خطوط کے متن سے کر سکتے ہیں۔راقم نے خاں صاحب کے بنام جین صاحب ستّاون خطوط جمع کیے ہیں۔ان میں سے قریب سات ابتدائی خطوط کے آخر میں ''نیاز مند''، چوبیس کے آخر میں ''مخلص'' اور چھبیس کے آخر میں صرف ''رشید حسن خاں'' درج ہے۔

تحقیق و تدوین جیسے موضوعات پر گفتگو کرتے کرتے خاں صاحب خط میں کبھی کبھی ایسا جملہ لکھ دیا کرتے تھے۔جس سے سارا خشکی پن، بھلے ہی تھوڑی دیر کے لیے، دور ہو جایا کرتا تھا،جین صاحب موتیابند کا آپریشن کرا چکے تھے اور خاں صاحب کروانا چاہتے تھے،انہیں لکھتے ہیں:

> ''ارے صاحب! آپ نے جوانی میں بھی کسی کو ''اس نظر'' سے شاید ہی دیکھا ہو، پھر آپ کی آنکھوں میں خرابی کیسے در آئی؟ ہم گنہگاروں کی بات دوسری ہے''۔(مکتوب مرقومہ ۱۰ر فروری ۱۹۸۹ء، ''رشید حسن خاں کے خطوط'' جلد اول،ص ۸۷۔۷۸۶)

خاں صاحب جین صاحب سے تدوینی کاموں میں سامنے آنے والے قدیم و جدید الفاظ کے استعمال سے متعلق ہی نہیں پوچھا کرتے تھے، بلکہ جب کبھی ان کا کوئی نیا مضمون یا تبصرہ شائع ہوتا اس سے متعلق بھی ان کی رائے دریافت کرتے،اپنی ادبی سرگرمیوں کی انہیں اطلاع بھی دیا کرتے، مثلاً ان کا سب سے پہلا تدوینی کام فسانۂ عجائب مکمل ہو چکا تھا اور وہ چھپنے کے لیے چلا گیا تھا۔اس کی خبر وہ اپنے خط کے ذریعے یوں دیتے ہیں:

☆ ایف ۲۳/۷،لوئر ہری سنگھ نگر، رہاڑی کالونی، جموں۔۱۸۰۰۰۵، موبائل: ۹۴۱۹۸۲۸۵۴۲۔

"کل فسانۂ عجائب چھپنے کے لیے چلی گئی اور میرے سر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ سب سے پہلے اس کی ایک جلد آپ کے پاس پہنچے گی۔ شاید نومبر کے اواخر تک چھپ کر آسکے گی"۔ (مکتوب مرقومہ ۵/اکتوبر ۱۹۸۹ء، "رشید حسن خاں کے خطوط" جلد اول، ص ۷۸۷)

یہ خاں صاحب کا پہلا تدوینی شاہکار تھا، جو بیک وقت دو جگہ یعنی انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی اور انجمن ترقی اردو لاہور، پاکستان سے ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔

یہ کتاب ۱۹۸۲ء سے قبل مکمل ہوچکی تھی، مگر اشاعت کے سلسلے میں ایک ایسا رخنا آن پڑا جس سے اس کی چھپائی کا کام التوا میں پڑ گیا۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بیٹھ کر انھوں نے اس کلاسکی داستان کو تنہا مرتب کیا تھا۔ شعبے کے چند حضرات نے یہ بات کہہ دی تھی کہ اس پر صدر شعبہ کا نام بھی آنا چاہیے۔ حالانکہ اس وقت صدر شعبہ اردو تنویر احمد علوی صاحب تھے اور اس کا "پیش لفظ" بھی انھوں نے لکھ دیا تھا۔ خاں صاحب ٹھہرے نسلاً پٹھان، وہ اپنے کام میں کسی کی شرکت کیسے قبول کرتے۔ اپنے مکتوب مرقومہ ۷/اپریل ۱۹۸۳ء میں جین صاحب کو لکھتے ہیں:

"کتاب اب تک نہیں چھپی ہے اور بظاہر اس کے چھپنے کا امکان بھی نہیں معلوم ہوتا۔ مقدمے سے متعلق اگر کوئی بات ایسی ہو جس کا جواب میں لکھ سکوں، تو مطلع فرمایئے: جو کچھ میرے علم میں ہے، اس سے اطلاع دے دی جائے اور مجھے اس خدمت کی بجا آوری سے مسرت ہوگی۔

میں ۱۴/اپریل کو جموں جاؤں گا اور واپسی یکم مئی کو ہوگی۔ اس درمیان میں اگر آپ خط لکھیں تو عابد پیشاوری صاحب کی معرفت لکھیں۔ میں تفصیل سے جواب لکھنے کی کوشش کروں گا۔

ہاں آپ کے ایک سوال کا جواب یہ ہے کہ اس کتاب کو تنہا میں نے مرتب کیا ہے۔ شرکت غم کا ویسے بھی میں قائل نہیں، البتہ دوسرے نسخوں سے مقابلہ کر کے اختلاف نسخ تیار کرنے میں چار افراد سے مدد لی گئی ہے، جن میں سے ایک فرد تنویر صاحب بھی ہیں۔ کاپیاں میں نے خود پڑھی ہیں چار بار، اس کے بعد اس خیال سے

کہ کوئی غلطی کتابت کی مجھ سے اب بھی چھوٹ نہ گئی ہو، ڈاکٹر شارب ردولوی سے
میں نے درخواست کی اور شروع کے ۵۰ صفحات کو پانچویں بار انہوں نے پڑھا اور
جب ان صفحوں میں کوئی غلطی نہیں نکلی، تب اطمینان ہوا۔ البتہ فسانۂ عجائب کی مختلف
اشاعتوں کے نسخے چھ سات جگہ سے ملے اور اس حد تک یہ سب لوگ گویا شریک کار
ہیں۔ یہ ہے کل داستان''۔ (ایضاً ص ۷۷۰)

خط کے آخر میں ''نیاز مند رشید حسن خاں'' لکھنے کے بعد پانچ سطریں اور لکھتے ہیں۔ یہ بھی فسانۂ عجائب سے متعلق ہیں:

''ہاں فسانۂ عجائب کے حواشی ۴۴۰ صفحات پر محیط ہیں۔ اس کے بعض اجزا
نموتناً دو قسطوں میں اردو اکیڈمی کے رسالے اکادمی میں چھپے ہیں۔ اگر آپ کی نظر سے
یہ نہ گزرے ہوں تو مطلع فرمائیے، میں بھیج دوں گا۔ توقع تو یہی ہے کہ ان کو پڑھ کر
آپ خوش ہوں گے اور میرے طریقۂ کار کا بھی اندازہ کرسکیں گے۔ اس بات سے
ضرور مطلع فرمائیے۔ ان اجزا کو میں اپنے ساتھ جموں لیتا جاؤں گا اور اگر آپ کا خط
وہاں مجھے ملا تو وہیں سے ان کو آپ کے پاس بھیج دوں گا''۔ (ایضاً ص ۷۷۰)

خاں صاحب کا اب تک کوئی تدوینی کارنامہ منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ وہ کام مکمل بھی کر چکے تھے، پھر بھی وہ جین صاحب سے اپنے طریقۂ کار سے متعلق مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ انہیں اپنے سے عمر میں اور ادبی معاملات میں بڑا سمجھتے تھے۔

فسانۂ عجائب مکمل ہوچکی تھی۔ اس کا ''پیش لفظ'' تنویر احمد علوی صاحب نے لکھ دیا تھا، پھر بھی یہ کتاب چھپنے نہیں جاسکی۔ اس کی روداد وہ جین صاحب سے یوں بیان کرتے ہیں:

''آپ کے تنویر علوی صاحب کے پیش لفظ کا اقتباس ضروری درج ذیل ہے:
میرے اور شعبہ اردو دانش گاہ دہلی کے دوسرے ساتھیوں کے لیے یہ بے حد
طمانیت و شادمانی کی بات ہے کہ نئے تعلیمی سال ۸۳۔۱۹۸۲ء کے دوران دبستان
لکھنؤ کی معروف ادبی تصنیف اور نثری داستان فسانۂ عجائب کی تحقیقی اشاعت عمل
میں آرہی ہے، جس کی ترتیب و تحشیہ کا نہایت اہم کام رشید حسن خاں صاحب نے

انجام دیا ہے۔

رشید حسن خاں اپنی تحقیقی ژرف نگاہی اور تنقیدی بصیرت کے لحاظ سے ہندو پاک کے علمی و ادبی حلقوں میں ایک خاص امتیاز اور درجۂ اعتبار رکھتے ہیں اور یہ بات خود شعبۂ اردو اور اس دانش گاہ کے لیے وجہ تمیز و تخصیص قرار دی جاسکتی ہے کہ وہ تقریباً پچھلی ایک ربع صدی سے شعبے کے ادارۂ تصنیف و تالیف سے وابستہ ہیں۔

رشید حسن خاں نے اس کام کو جس لاگ، جس لگن اور جس لگاؤ کے ساتھ انجام دیا ہے، اس کے معیاری نمونے ہماری ادبی تدوین کی تاریخ میں بہت کم یاب ہیں۔ ان کا اپنا مطالعہ، تجزیاتی ذہن اور زبان و قواعد کے مسائل سے ان کی گہری دلچسپی قدم قدم پر ان کے ساتھ نہ ہوتی، تو یہ کام اس سطح اور اس طرح پر انجام دیا جانا ممکن نہ ہوتا''۔

علوی صاحب نے پہلے دن سے قطعی طور پر مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ یہ کتاب چھپے گی اور صرف تمہارے نام سے چھپے گی، انہوں نے صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے ضابطے کے مطابق پیش لفظ بھی لکھ کر دے دیا تھا (جس کے بعض اجزا کو اوپر نقل کر دیا گیا ہے)۔ پھر اس کے بعد کیا پیچ پڑا، اس سے میں بے خبر ہوں، کہ یہ کتاب نہیں چھپ سکی۔ اب میں اور کیا عرض کروں۔ بہر حال، انہوں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ ان کا نام بحیثیت مرتب آنا چاہیے، وہ اس معاملے میں بے قصور ہیں۔ ہاں سب باتوں کے باوصف کتاب نہیں چھپی، یعنی اصل بات وہیں کی وہیں رہی۔

میں نے اب بددل ہو کر اس کو باندھ کر رکھ دیا ہے، چھپے یا نہ چھپے، میری بلا سے، اس کا مقدمہ میں نہیں لکھ پایا تھا۔ ظاہر ہے کہ مقدمہ کتاب کے مکمل ہونے پر ہی لکھا جاتا ہے۔ کتاب کی کتابت جب مکمل ہوگئی اور مقدمہ شروع کرنے ہی کو تھا کہ دوسرے جھگڑے پیدا ہوئے اور میں نے قلم کو روک لیا۔

اب بیشتر مباحث ذہن سے نکل گئے ہیں، اگر کبھی لکھنا پڑا تو معلوم نہیں لکھ بھی سکوں گا یا نہیں۔ میں اپنی زندگی میں اس قدر بے چارگی اور بے کسی کے احساس سے اس سے پہلے کبھی دوچار نہیں ہوا تھا، اب معلوم ہوا کہ جی لگا کر کام کرنا فضول ہے، بلکہ کام کرنا ہی بے کار ہے۔ اب تو ریٹائر ہونے کے بعد ہی شاید کچھ کرسکوں، بے دلی ہائے تمنا کا مفہوم اب معلوم ہوا۔

ظہیر صاحب نئے صدر شعبہ ہیں، میرے ہمدرد ہیں اور مخلص، میں نے ان سے ابھی بات نہیں کی ہے، ابھی وہ دوسرے کاموں میں الجھے ہوئے ہیں۔ پہلے دو مہینے کے بعد ان سے گفتگو کروں گا اور تب معلوم ہو سکے گا کہ صورت حال کیا ہے۔ شاید کوئی صورت نکل آئے، مگر جی بے طرح اچاٹ ہوا ہے اس جھگڑے میں۔

آپ کے مخلصانہ کلمات نے بہت تسکین بخشی ہے، شکرگزار ہوں"۔ (ایضاً، خط مرقومہ ۵ مارچ ۱۹۸۴ء، ص ۷۲۔۷۷)

آپ نے دیکھا کہ خاں صاحب جین صاحب کو اپنا مخلص مانتے ہوئے خطوط میں کس طرح اپنی بے چارگی اور بے کسی کا اظہار ٹوٹے دل سے کرتے ہیں۔ لیکن جین صاحب بھی اپنے مخلصانہ برتاؤ سے ان کی عزت افزائی کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ نازک ادبی رشتے کی بنیاد پر ہو رہا ہے۔ ایسی باتوں کا سلسلہ ایسی ہی دو شخصیات کے درمیان قائم رہ سکتا ہے، جو ایک دوسرے کے بہت قریب ہوں۔

خاں صاحب کے ستاون خطوط میں جن ادبی باتوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان سب کا یہاں بیان کرنا ممکن نہیں۔ خاں صاحب نے اگر جین صاحب کے خطوط کو محفوظ کیا ہوتا تو ان کی روشنی میں یہ ادبی رشتہ ایک اور نئی صورت میں سامنے آتا۔ شاید وہ رشتہ اپنی مثال آپ ہوتا۔

جین صاحب خاں صاحب کو ایک کامیاب محقق و نقاد مانتے ہیں، جس نے تلاش و تحقیق کی بنا پر تنقید کرنا اپنا خاص رنگ بنا لیا ہے۔ دونوں کا ادبی دور بیسویں صدی کا نصف آخر اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائی پر پھیلا ہوا ہے۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک کو دم توڑتے ہوئے اور جدیدیت و مابعد جدیدیت کو بھی آخری سانس لیتے ہوئے دیکھا۔

انہیں کوئی بھی تحریک متاثر نہیں کر سکی۔ ان کا واحد اصول تھا، تحقیق میں سچ کی تلاش۔ جھوٹ کسی نے بھی کہا ہو وہ جھوٹ ہے، اس کے ساتھ کبھی سمجھوتہ نہیں کیا جا سکتا۔ جین صاحب کو کم مگر خاں صاحب کو اس کی بہت بڑی سزا بھگتنا پڑی، شاید اس بات کا ذکر گذشتہ صفحات میں کہیں آیا ہے۔

جین صاحب نے خاں صاحب کی ہر کتاب کا مطالعہ کیا ہے اور ان پر تبصرے بھی لکھے ہیں۔ ایسا ہی ایک تبصرہ انتخاب کلام ناسخ پر ہے جو پہلے کتاب نما میں شائع ہوا اور بعد میں ان کی کتاب "ذکر و فکر" میں شامل ہوا۔ جین صاحب اس سوا سو صفحات کے مقدمے سے اس لیے خوش ہیں کہ رشید

حسن خاں صاحب پہلے ایسے شخص ہیں جنہوں نے ثابت کردیا کہ اصلاح زبان کے ضابطے لکھنؤ میں ناسخ نے نہیں بلکہ ان کے شاگردوں نے بنائے تھے۔ ساتھ ہی انہوں نے ناسخ کے رنگ سخن کا بھی تعین کردیا تھا۔

رشید حسن خاں صاحب کا مرتبہ بحیثیت محقق و مدون اور تنقید نگار کے جین صاحب کی نظروں میں بلند نہیں تھا، بلکہ ماہر زبان و قواعد کے بھی وہ اپنے دور کے بہت سے حضرات سے آگے تھے۔ ''اردو املا'' اور'' زبان اور قواعد'' میں جو انہوں نے کارنامے انجام دیے آنے والی صدیوں میں ان کی نظیر نہیں مل پائے گی۔ جین صاحب لکھتے ہیں:

''صحت زبان کے سلسلے میں ان کا پہلا شاہکار ان کی ضخیم کتاب ''اردو املا'' (ترقی اردو بورڈ دہلی ۱۹۷۴ء) اور دوسرا شاہکار اسی ادارے سے شائع شدہ ان کے مضامین کا مجموعہ ''زبان اور قواعد'' (دہلی ۱۹۷۶ء) ہے۔ ان کتابوں میں انہوں نے زبان کے مسائل پر جس علم و فضل اور قدیم کتب میں جس گہری نظر کا ثبوت دیا ہے وہ ہمارے زمانے میں تقریباً نایاب ہے۔ ''اردو املا'' میں انہوں نے متعدد الفاظ کے جس تلفظ اور املا کی سفارش کی ہے ان میں سب سے اتفاق کرنا مشکل ہے لیکن انہوں نے اپنے موقف کی تائید میں جو اسناد پیش کی ہیں انہیں رد کرنا آسان نہیں، ''زبان اور قواعد'' کے مضامین میں جن قدیم کتب اور رسالوں سے حوالے اور اقتباسات دیے ہیں ان میں سے بعض کے ہم نام لیا کرتے ہیں، انہیں دیکھتے نہیں۔ دوسری طرف متعدد ایسے مآخذ ہیں جن کو ہم نے، کم از کم میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اردو کے کلاسکی دفینے پر ایسی نظر اس دور میں شاید ہی کسی دوسرے شخص کی ہو۔ مجموعے کے آخر میں انہوں نے بحر لکھنوی کا رسالہ ''بحر البیان'' پورے کا پورا شامل کردیا ہے۔ یہ خوب کیا''۔ (خصوصی شمارہ، کتاب نما، ''رشید حسن خاں، حیات اور ادبی خدمات'' اشاعت ۲۰۰۲ء، ص ۶۵)

رشید حسن خاں صاحب نے صرف بحر لکھنوی کے رسالہ ''بحر البیان'' ہی پر قلم نہیں اٹھایا بلکہ وہ اس سے بہت پہلے ''لغت اور استعمال عام'' جیسے مسئلے پر ''الحمرا'' لاہور میں ۱۹۵۰ء کے قریب دو سال تک اثر لکھنوی سے بحث کرچکے تھے۔ بعد میں انہی اجزا کی ترتیب نو کرکے انہوں نے اسے اپنی

کتاب ''زبان اور قواعد'' ۱۹۷۶ء میں شامل کرلیا۔ (مکاتیب رشید حسن خاں بنام رفیع الدین ہاشمی، لاہور، اشاعت ۲۰۰۹ء، ص ۱۵۸)

اسی طرح کا ایک اور مضمون انھوں نے بعنوان ''اغلاط اللغات'' لکھا، جو اردو ادب نئی دہلی، مارچ ۱۹۵۷ء، میں ص ۴۲ تا ۹۲ شائع ہوا۔ اس میں اردو، فارسی اور عربی کے چند مستند اور متداول لغات ان کے پیش نظر تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان میں اغلاط و مسامحات کے علاوہ باہم سخت اختلافات ہیں اور لطف یہ ہے کہ بیشتر یہ اختلافات مسامحات کا نتیجہ ہیں۔ متداول لغات عام لوگوں کے پیش نظر رہتے ہیں اور انہیں سے معانی، حرکات اور دوسری زبانوں کے مرادف الفاظ کے متعلق فیصلے حاصل کیے جاتے ہیں۔ بعض اوقات کسی لفظ کی تحقیق یا دوسرے لغات سے تطبیق کے سلسلے میں کسی لغت پر اعتماد کرکے سند حاصل کرلی جاتی ہے۔ بعد کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ بے سروپا ہے، جو حوالہ اس لغت میں درج ہے، اس کا کہیں وجود نہیں۔ یا جو معانی وحرکات اس میں درج ہیں، ان کے علاوہ یا ان کے خلاف معانی وحرکات دوسرے لغات میں درج ہیں۔ عام لوگوں کو اس سے سخت الجھن ہوتی ہے۔ نیز تحقیقی کام کرنے والوں کو بھی حوالہ دینے کے سلسلے میں غلط فہمی ہوسکتی ہے''۔ (مشمولہ ''مقالات رشید حسن خاں'' جلد اول، اشاعت ایپلائڈ بکس، نئی دہلی۔ ۲، ۲۰۱۶ء، ص ۳۲۱، مرتب راقم الحروف)

اس مضمون میں خاں صاحب نے جن لغات سے الفاظ کا انتخاب کیا ہے ان کے نام ہیں:

سرمایہ زبان اردو (جلال)، نور اللغات، محاورات داغ، غیاث اللغات، ازاحۃ الاغلاط (؟)، فرہنگ عامرہ، قاموس اور رسالہ عبدالواسع (یہ لغت کی کتاب نہیں لیکن مصنف نے فارسی الفاظ کی کچھ تفصیلات درج کی ہیں)۔ (ایضاً ص ۳۲۲)

۱۹۶۹ء میں غالب کا صد سالہ جشن منایا گیا۔ مالک رام صاحب نے ''دیوان غالب صدی ایڈیشن، کے نام سے کتاب شائع کی۔ خاں صاحب نے جلسے میں زبانی گفتگو کی۔ مالک رام صاحب پہلے سے ہی دل کے عارضے میں مبتلا تھے۔ خاں صاحب نے کہہ دیا کہ ''اس ایڈیشن کے مرتب نے تدوین کے اصولوں کو جس طرح نظر انداز کیا ہے، اس کی مثالیں کمیاب ہیں...... جس نسخے کو انھوں نے بنیاد بنایا ہے، اسے بچشم خود دیکھا ہی نہیں''۔ (ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، رشید حسن خاں، اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء، ص ۱۴۹، ۱۵۳، پہلی بار یہ مضمون تحریک، دہلی کے اپریل ۱۹۷۴ء کے شمارے میں شائع ہوا)

ایسے ہی ایک واقعے کا ڈاکٹر خلیق انجم نے ذکر کیا ہے کہ:

''ایک دفعہ غالب انسٹی ٹیوٹ میں غالب پر سمینار ہورہا تھا۔مالک رام صاحب نے مقالہ پڑھا جسے بہت پسند کیا گیا۔لیکن رشید حسن خاں صاحب نے کھڑے ہوکر دو تین اعتراضات کردیے۔مالک رام صاحب کو یہ بات ناگوار گزری،ہال کے برابر سکریٹری کا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا،مالک رام اٹھ کر اس کمرے میں چلے گئے''۔(ہفت روزہ ''ہماری زبان''،نئی دہلی،رشید حسن خاں نمبر،یکم تا ۲۸ ستمبر ۲۰۰۶ء،ص ۴)

اس بات کا مالک رام صاحب کے دل پر اثر ہوا۔خلیق انجم نے انہیں دوائی کھلا کر ان کے گھر چھوڑا۔(تفصیل کے لیے اسی شمارہ میں خلیق انجم کا مضمون، ''ممتاز محقق اور متنی نقاد رشید حسن خاں'' دیکھیے)

جین صاحب نے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا:

''رشید حسن خاں نے مالک رام کے مرتبہ دیوان غالب پر اعتراض کیے۔ان سے یہ کہنے کو جی چاہتا تھا کہ حضرت دوسروں کے بخیے تو بہت ادھیڑ چکے،کچھ خود بھی کرکے دکھایئے تاکہ معلوم ہو کہ آپ کتنے پانی میں ہیں۔خاں صاحب نے اس ساکت سوال کا مسکت جواب دیا اور جواب بھی ایک نہیں دو دو۔انہوں نے پہلے فسانۂ عجائب کی اور پھر باغ و بہار کی تدوین کی اور اس طرح کہ آگے سوچا ہی نہیں جاسکتا''۔(کتاب نما کا خصوصی شمارہ،جولائی ۲۰۰۲ء،ص ۶۶۔۶۵)

ان دونوں حضرات میں آپسی ادبی رشتہ بڑا نازک تھا،لیکن دونوں ایک دوسرے کی کتابوں پر اپنی آرا کا کھل کر اظہار کرتے تھے۔جین صاحب فسانۂ عجائب کا مختصر تعارف پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''قطع کلام کرکے مجھے ایک بات کہنی ہے۔رشید حسن خاں نے اس کتاب میں نیز باغ و بہار میں فٹ نوٹ میں بہت سے اہم مطالب درج کیے ہیں،جن کا متن مقدمہ سے براہ راست تعلق ہے۔انہیں حاشیے میں کیوں جگہ دی گئی،متن میں کیوں نہیں؟ مثلاً زیر نظر کتاب کے ص ۲۸ کے حاشیے نمبر ۴ کو جس میں مفتی انتظام اللہ شہابی کے سرور کو اکبر آبادی قرار دینے کا ذکر ہے۔خاں صاحب کے ذہن میں حاشیے کے

حصار کی بات صاف نہیں معلوم ہوتی۔ فٹ نوٹ میں عام سے ماخذ کا حوالہ دیا جاتا ہے یا ایسے تبصرے جو متن میں دیے جائیں تو دخل در معقولات معلوم ہوں۔ حتی الامکان تبصراتی حاشیے متن ہی میں شامل کرنے چاہئیں۔ حواشی متن پر غالب نہ ہونے پائیں نہ اس کے حریف ہوں۔ حواشی کے مطالب کے صحیح معیار کے لیے ملاحظہ ہو میری کتاب ''تحقیق کا فن''۔ (لکھنؤ ۱۹۹۰ء، ص ۲۴ ۔ ۳۲۳)

خاں صاحب جب فسانۂ عجائب مرتب کر رہے تھے تو وقتاً فوقتاً اس کے اجزا مشورے کے لیے جین صاحب کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے۔ کیا اس وقت جین صاحب نے خاں صاحب کو ان باتوں سے آگاہ نہیں کرایا۔ دوسری بات جین صاحب کی کتاب ''تحقیق کا فن'' ۱۹۹۰ء میں منظر عام پر آئی، اس میں بہت سے مغربی تحقیق و تدوین کے اصول درج ہیں۔ جیسا کہ جین صاحب گذشتہ صفحات میں اس کا اقرار کر چکے ہیں۔

خاں صاحب فسانۂ عجائب کو ۸۳ ۔ ۱۹۸۲ء میں مکمل کر چکے تھے۔

جین صاحب کا اگلا اعتراض ہے کہ:

''خاں صاحب نے مطبوعہ نسخوں کے مخفف کے طور پر حرفی علامات ح، م، ک وغیرہ کا استعمال کیا ہے۔ ان سے مرتب کو سہولت ہوجاتی ہے لیکن قاری کی الجھن کا سامان ہوجاتا ہے۔ اسے یاد نہیں رہتا کہ کون سا حرف کس نسخے کی علامت ہے۔ اگر ان کے بجائے لفظی مخففات مثلاً حسنی ۱۔ مصطفائی، حیدری، حسنی ۲۔ محمدی، افضل، نجم اور نول وغیرہ استعمال کرتے تو ذہن کو بھٹکنا نہ پڑتا''۔ (کتاب نما کا خصوصی شمارہ، ص ۶۸)

جین صاحب کی یہ بات درست ہے (راقم کو اس کا تجربہ ہو چکا ہے)۔

اعتراض نمبر ۳: ''خاں صاحب اپنی تحریروں میں اشخاص اور کتب کے ناموں کے اوپر خط کھینچتے ہیں۔ وضاحت کو اس کی ضرورت نہیں، ہاں بدنمائی ضرور پیدا ہوجاتی ہے''۔ (ایضاً، ص ۶۹)

خاص خاص ناموں پر خط کھینچنے سے یہ باقی متن سے روشن ہوجاتے ہیں جس سے ذہن میں ان کی پہچان بڑھ جاتی ہے۔ جین صاحب اسے ''بدنمائی'' قرار دیتے ہیں اصل میں یہ ''خوش نمائی'' ہے، ہر نام پر خط کھینچنا اور دوران تصحیح اس کا خیال رکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ جو لوگ سہل پسند ہیں وہ بھلے ہی

اس اصول کی پابندی نہ کریں۔

اعتراض نمبر ۴: ''انہوں نے اپنے مقدمے میں ایک اور نرالے رمز اوقاف بڑے بریکٹ [ ] کا استعمال کیا ہے۔ اردو اور انگریزی میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ انگریزی میں فقرۂ معترضہ کو دو لمبی لکیروں کے بیچ محصور کر دیا جاتا ہے اور یہ قوسین کا نعم البدل ہیں۔ اردو میں اگر اُلٹے کاما سے اگر کام نہ چل سکے اور وضاحت کی غیر معمولی کوشش ہو تو چھوٹے بریکٹ یعنی قوسین ( ) کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ترتیب متن میں بڑا بریکٹ صرف وہاں استعمال کیا جاتا ہے جہاں دوسرے کی عبارت کے بیچ چھوٹے ہوئے ایک آدھ لفظ کو خلا پُر کرنے کے لیے لکھا جاتا ہے۔ بڑا بریکٹ ظاہر کرتا ہے کہ اس سے محصور الفاظ اصل متن میں موجود نہ تھے، مدون نے قیاساً لکھے ہیں۔ اس سے ہٹ کر عام تحریر میں بڑے بریکٹ کا استعمال خواہ مخواہ الجبرائی رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ چھوٹے بریکٹ کا استعمال بھی کم سے کم کرنا چاہیے''۔ (ایضاً، ص ۶۹)

یہ بات درست ہے کہ بڑے بریکٹ کے بجائے چھوٹے بریکٹ سے کام لیا جا سکتا تھا۔ فسانۂ عجائب کے مقدمے میں بڑے بریکٹ ہی لگائے گئے ہیں۔

اعتراض نمبر ۵: ''خاں صاحب کئی جگہ ''ہے ہی'' کی جگہ ''ہئی'' کا استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً مقدمۂ فسانہ عجائب میں ص ۵۲ سطر ۶ میں مقدمہ باغ و بہار میں ص ۶۳ سطر ۱۹ میں۔ خاں صاحب کو میر امن یا آغا حیدر حسن دہلوی بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ داستان اور انشائیے میں یہ روپ جائز ہو سکتا ہے، علمی تحریر میں نہیں''۔ (ایضاً، ص ۶۹)

فسانۂ عجائب اور باغ و بہار کے مقدموں کے جن صفحات و سطور کی جین صاحب نے نشان دہی کی ہے، وہاں واقعی ''ہے ہی'' کی جگہ ''ہئی'' لکھا ہے۔ جیسے ''طویل زمانی فصل تو ہئی'' اور [جو ترجمہ تو خیر ہئی نہیں]۔ یہ دونوں قصے ہیں تو داستانی ہی، شاید اسی لیے خاں صاحب نے یہ انداز اختیار کیا ہو۔ ورنہ عام تحریر میں وہ یہ انداز اختیار نہیں کرتے۔ ان کی دوسری کتابوں میں یہ طریقۂ کار نظر نہیں آتا۔

اعتراض نمبر ۶: ''مجھے ان کی زبان کے محض دو الفاظ کے بارے میں عرض کرنا ہے۔ انہوں نے جا بجا مصرع، مطبع وغیرہ کو امالے کی شکل میں مصرعے، مطبعے لکھا ہے۔ اپنی کتاب اردو املا میں ص ۴۳-۴۴۱ پر ان الفاظ سے بحث کی ہے۔ بحر لکھنوی اور جلال ان الفاظ کو یے کے بغیر لکھنے کی سفارش کرتے ہیں۔ حرف ماقبل کو کسرے سے ادا کرنا امالے کے لیے کافی ہے، جبکہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

واحد محرف کی شکل میں بھی یے کا اضافہ پسند کرتے ہیں۔ رشید حسن خاں آخر الذکر کے مقلد ہیں۔ میری رائے میں بحر اور جلال کا موقف قابل ترجیح ہے''۔ (ایضاً، ص ۶۹)

شاید خاں صاحب کا مضمون ''اغلاط اللغات'' جین صاحب کی نظر سے نہیں گزرا جو اردو ادب نئی دہلی مارچ ۱۹۵۷ء کے شمارے کے ص ۴۲ تا ۹۲ پر شائع ہوا تھا۔ اس میں وہ بحر لکھنوی کے لغت بحر البیان اور جلال کے سرمایہ زبان اردو دونوں کے بعض اندراجات کو مستند ماننے سے انکار کر چکے ہیں۔ ان کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ (یہ مضمون خاں صاحب کی کسی کتاب میں شامل نہیں، ''مقالات رشید حسن خاں'' از راقم الحروف، جلد اول، اشاعت ۲۰۱۶ء، ص ۳۲۱ تا ۳۸۴ پر یہ محیط ہے۔ راقم ''مقالات رشید حسن خاں'' کی چار جلدیں مرتب کر چکا ہے، جن میں سے جلد اول شائع ہو چکی ہے اور باقی تین زیر طبع ہیں اور پانچویں جلد کمپوز ہو رہی ہے)

جین صاحب نے فسانۂ عجائب ہی کی طرح کے چھوٹے چھوٹے اعتراض باغ و بہار پر بھی لگائے ہیں، مگر ساتھ ہی انہوں نے خاں صاحب کے تدوینی اعترافات کا ذکر کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

۱۔ ''رشید حسن خاں سے پہلے کئی محققوں نے اس کتاب (فسانۂ عجائب) کی ترتیب کی لیکن جب انہوں نے کی تو معلوم ہوا کہ اس کی تدوین کیسے کی جانی چاہیے تھی۔ چند صفحات میں اس کے محاسن کا احاطہ مشکل ہے۔ بہتر ہے کہ قاری خود اس کی ورق گردانی کر کے گل چینی کرے۔ اس کی ابتدا میں ۱۱۴ صفحات کا مقدمہ ہے۔ پھر صحیح ترین متن، اس کے بعد تقریباً ڈھائی سو صفحوں پر ضمیمے، فرہنگ اور اشاریہ۔ میں نہیں جانتا کہ مقدمہ، متن اور تعلقات میں کس حصے کو زیادہ عالمانہ قرار دوں''۔ (ایضاً، ص ۶۶)

۲۔ ''مقدمے کے ابتدائی حصے میں انہوں نے تدوین کی حدود متعین کی ہیں اور اس سے اتفاق کرنا ہوگا''۔ (ایضاً)

اس کے بعد مقدمے کے ص ۲۲ سے خاں صاحب کی عبارت کا ٹکڑا درج کیا ہے۔

۳۔ ''نوازش اور اصلاح'' کے عنوان کے تحت فسانۂ عجائب میں سرور کے استاد نوازش کے اشعار کی بحث بڑے عارفانہ انداز میں کی ہے۔ فسانۂ عجائب کے صاحب فرمائش

کے بارے میں یہ دریافت کہ وہ سرور کا مرد محبوب ہوسکتا ہے دلچسپ اور قابل قبول ہے،ص ۴۵''۔(ایضاً،ص ۶۷)

خاں صاحب نے غیر جانب دارانہ طور پر فسانۂ عجائب کی تدوین کی ہے۔اس کی دو مثالیں جین صاحب یوں پیش کرتے ہیں:

۴۔''فسانۂ عجائب کی نثر میں بہت سے مقامات پر کچا پن محسوس ہوتا ہے اور لفظی رعایتوں کی غیر ضروری پابندی نے بے ڈھنگا پن بھی پیدا کیا ہے۔جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے،اس میں ان کی کم مشقی کا دخل کچھ زیادہ معلوم ہوتا ہے''۔(ص ۶۵)

''متعدد مقامات پر بیان میں ایسا بھدّا پن ہے کہ اسے بے اختیار پھوہڑ پن کہنے کو جی چاہتا ہے''۔(ص ۶۹)

''انہوں نے اس کی جو مثالیں دی ہیں وہ ان جیسا خود اعتماد شخص ہی فراہم کر سکتا تھا۔خاصے کے یہ بیانات ان کی تنقیدی نظر کی دین ہے۔انہوں نے جو لسانی تجزیہ کیا ہے وہ روایتی تجزیے سے بہت مختلف اور مفید تر ہے''۔(ایضاً،ص ۶۸)

جین صاحب خاں صاحب کی تحقیقی وتنقیدی صلاحیت کا اعتراف تو ہمیشہ کرتے آئے ہیں، مگر ماہر لسانیات ہوتے ہوئے جس طرح انہوں نے خاں صاحب کے لسانی تجزیے کا ذکر کیا ہے یہ اپنے میں ایک بڑی بات ہے۔خاں صاحب نے ہمیشہ اپنے آپ کو لسانیات کا مرد میدان نہیں کہا۔

۵۔''فسانۂ عجائب کے مقدمے کے آخری حصے میں علامات و رموز اوقاف کی تفصیل ہے۔ان کے ذریعے سے انہوں نے صحت متن کی جو کوشش کی ہے وہ بے نظیر ہے''۔ (ایضاً،ص ۶۸)

۶۔''فسانۂ عجائب کے متن کو اس صحت کے ساتھ پیش کرنا کہ ہر فقرہ اور ترکیب قطعی طور پر منشائے مصنف کے مطابق ادا ہو جائے اس ایڈیشن کا سب سے بڑا اکتساب ہے۔اسی کے لیے تو خاں صاحب نے اتنی کھکیڑ اٹھائی ہے''۔(ایضاً،ص ۷۰)

۷۔''تصنیفی اعتبار سے باغ و بہار فسانۂ عجائب پر مقدم ہے لیکن رشید حسن خاں نے اس کی تدوین فسانۂ عجائب کے بعد کی''۔(ایضاً،ص ۷۱)

۸۔ ’’میر امن نے دلی کی بول چال کا روزمرہ لکھا ہے، جس میں بارہا نامانوس روپ آ گئے ہیں۔ پیشتر کے مرتبین نے انہیں سہو طباعت سمجھ کر بدل دیا لیکن رشید حسن خاں نے میر امن کے ہاتھ کی لکھی گنج خوبی دیکھی ہے۔ ہندی مینول کے مطبوعہ اوراق، بقیہ حصے پر مشتمل مخطوطہ گل کرسٹ کا نظام اوقاف، ان سب کی مدد سے وہ میر امن کے سویدائے دل میں اتر گئے ہیں، ہر لفظ اور ہر محاورے کو اسی طرح لکھا ہے جو میر امن کا منشا رہا ہوگا‘‘۔ (ایضاً، ص ۷۲)

خاں صاحب میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ پوچھنے میں کبھی شرم محسوس نہیں کرتے تھے۔ کوئی شخص ان سے بڑا ہو، ان کا ہم عصر ہو، ان سے چھوٹا ہو یا ان کا طالب علم ہی کیوں نہ ہو۔ جب انہیں یقین ہو جاتا کہ جو کچھ پوچھا گیا ہے اس کا جواب درست ہے تو وہ اسے درج کتاب کرتے اور حواشی میں شکریے کے ساتھ اس کا نام لکھتے۔ اسی بات کو جین صاحب نے یوں لکھا ہے:

۹۔ ’’مجھے توجہ دلانی ہے کہ خاں صاحب نے ہر جگہ دوسروں سے ممنونیت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے‘‘۔ (ایضاً، ص ۷۲)

۱۰۔ ’’کتاب کے مستند متن کے بعد تین ضمیمے ہیں .... یہ ضمیمے ایسی کانیں ہیں جن میں فاضلانہ معلومات کے سونے کے ڈلے بھرے پڑے ہیں۔ ان سے استفادے کے لیے کئی برس کا عرصہ درکار ہے‘‘۔ (ایضاً، ص ۷۳)

۱۱۔ ’’اب تک اردو نثر میں بہترین تدوینات مولانا عرشی اور مالک رام و مختار الدین احمد کی تھیں، رشید حسن خاں نے فسانۂ عجائب اور باغ و بہار کو اس انداز سے مدون کیا ہے کہ یہ ایسے مکمل و مثالی کام ہیں جن کی نظیر نہ ماضی میں ملتی ہے، نہ عرصے تک مستقبل میں ملنے کی امید ہے۔ یہ کتابیں تدوین کا ایسا بیش بہا خزینہ ہیں، جن میں لامتناہی دولت چھپی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک ایسی کتاب تیار کرنے کے لیے پندرہ بیس سال کا عرصہ درکار ہے‘‘۔ (ایضاً، ص ۷۳)

رشید حسن خاں صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھنے سے ہوا۔ صرف سات آٹھ برس کے اندر اندر ان کی شہرت ہندو پاک کے ادبی حلقوں تک پہنچ گئی۔ اسی شہرت کی وجہ

سے دہلی یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو نے انہیں اپنے ہاں بلوالیا۔ یہاں رہ کر انھوں نے اردو کی ادبی تاریخ، اردو شاعری کا انتخاب، علی گڑھ تاریخ ادب اردو، تحقیق سے متعلق بعض مسائل، تذکرۂ معاصرین اور دیوان غالب، صدی ایڈیشن جیسے مضامین لکھے جن سے ان کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا۔ ۱۹۷۴ء میں اردو املا جیسی کتاب نے سونے پہ سہاگے کا کام کیا۔ ۱۹۷۴ء کے بعد ہی انھوں نے اپنا رخ تدوین کی طرف موڑ دیا۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد ۱۹۹۰ء میں ان کا پہلا تدوینی شاہکار فسانۂ عجائب منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد ان کے چھ کلاسیکی متن ایک کے بعد ایک منظر عام پر آئے۔ جنھوں نے انہیں محقق و مدون کے طور پر شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔

جین صاحب کا ان کے ساتھ گہرا ادبی رشتہ تھا، انہیں اس بات کا احساس تھا کہ جو مقام خاں صاحب کو ملنا چاہیے تھا وہ نہیں مل پایا۔ اسی دلی احساس کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''کئی مغربی و مشرقی علما کلاسیکی زبانوں کے متون کو مرتب کر کے شہرت دوام پا چکے ہیں۔ رشید حسن خاں کا کام کسی سے کم معیار کا نہیں۔ اگر وہ کسی یونیورسٹی میں پروفیسر ہوتے تو یورپ و امریکا کی سیر کیے ہوتے۔ عظیم الشان جلسوں میں صدر مملکت یا وزیر اعظم سے رسم اجرا کراتے تب ان کارناموں کو عظیم الشان قرار دیا جاتا۔ بصورت موجودہ ایسے شاہکاروں کا جو غلغلہ ہونا چاہیے، نہیں ہوا۔ حضرت امیر حمزہ نے طلسم ہوش ربا فتح کیا تھا۔ تدوین کے ہفت خوان میں رشید حسن خاں کی تسخیر اس سے کم نہیں۔ اگر تدوین کوئی ملت ہوتی تو یہ کتابیں اس کے دو مقدس صحیفے قرار پاتے اور ان کا مدون ان کا نبی، لیکن میں انہیں پیغمبر تدوین کہنے پر قانع نہیں، انہیں خدائے تدوین کہوں گا گو اس پر کتنے زعما چیں بہ جبیں ہوں۔ مجھے رشید حسن خاں سے محبت نہیں (کدبھی نہیں)۔ انہوں نے کبھی میرے بارے میں ایک لفظ نہیں لکھا۔ میں نے اپنی کتاب ''تحقیق کا فن'' انہیں پیش کی تو انھوں نے لکھا کہ میں اس کا ایک ایک لفظ پڑھوں گا۔ اس کے بعد اس کے بارے میں مجھے کچھ بھی نہیں لکھا۔ شاید کتاب کی ورق گردانی کی ہی نہیں لیکن میں کیا کروں، میں فسانۂ عجائب اور باغ و بہار کے مرتب کی قدر شناسی کے لیے مجبور ہوں۔ میں کہا کرتا تھا کہ اردو میں دانشوری کی روایت کمزور ہے۔ (رشید حسن خاں) کے دونوں کارناموں نیز ان کی کتاب ''زبان اور قواعد'' کے ہوتے یہ داغ رفع ہو جاتا ہے''۔ (ایضاً، ص ۷۴)

جین صاحب نے اپنے ادبی رشتے کا حق ادا کردیا ہے، خاں صاحب کو ''خدائے تدوین'' کہہ کر جین صاحب کا یہ کہنا کہ ''انھوں نے میرے بارے میں ایک لفظ نہیں لکھا''، درست نہیں ہے۔ جین صاحب کا یہ مضمون ''خدائے تدوین'' خصوصی شمارہ کتاب نما جولائی ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا ہے، جبکہ اس سے قبل خاں صاحب کا مضمون بعنوان ''جین صاحب'' ماہنامہ آجکل نئی دہلی کے شمارہ اپریل ۱۹۹۹ء میں ص ۸ تا ۱۱ شائع ہوچکا تھا۔ شاید وہ ان کی نظر سے نہیں گزرا یا انہیں یاد نہیں رہا۔ خاں صاحب کا لکھا ہوا یہ مضمون نہایت معلوماتی ہے۔ اس میں ان کی ادبی خدمات کا ذکر تو ہے ہی لیکن شاید کسی کو یہ علم نہیں ہوگا کہ جین صاحب کو شاستریہ سنگیت سے بھی شغف تھا۔ وہ راگ درباری سے واقف ہی نہیں تھے بلکہ اس کی ادائیگی پر بھی قادر تھے۔ اس کا ذکر خاں صاحب نے مضمون میں کیا ہے۔

جین صاحب کے آخری اقتباس کا یہ جملہ بھی توجہ کا مستحق ہے ''میں نے اپنی کتاب ''تحقیق کا فن'' انہیں پیش کی تو انہوں نے لکھا کہ میں اس کا ایک ایک لفظ پڑھوں گا۔ اس کے بعد اس کے بارے میں مجھے کچھ بھی نہیں لکھا۔ شاید کتاب کی ورق گردانی کی ہی نہیں''۔

خاں صاحب اپنے مکتوب مرقومہ ۴/اپریل ۲۰۰۰ء میں لکھتے ہیں:

''آج کل میں آپ سے متعلق میری جو تحریر اپریل ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی تھی، میں اس کی چند سطریں نقل کرتا ہوں، تاکہ ریکارڈ درست ہوجائے، اب سے چند سال پہلے ان کی جو کتاب تحقیق کا فن کے نام سے آئی ہے، جی تو میرا یہ چاہتا تھا کہ اس صحیفہ یادگار کے لیے اس پر مفصل مضمون لکھوں، لیکن ڈاکٹر عابد پیشاوری نے اس کتاب پر مفصل مضمون لکھنے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ مجھے اطمینان ہوگیا کہ وہ مجھ سے بہتر اس کام کو انجام دیں گے۔ اس کتاب کا میں نے خاص کر یوں نام لیا ہے کہ یہ ایسی کتاب ہے، جس میں بہت سے توجہ طلب اور بحث طلب مسائل زیر تحریر آئے ہیں''۔

(''رشید حسن خاں کے خطوط'' جلد اول، فروری ۲۰۱۱ء، از راقم الحروف، ص ۸۲۰)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاں صاحب نے تحقیق کا فن کا اچھی طرح مطالعہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ چند بحث طلب مسائل کو انہوں نے نوٹ بھی کیا تھا کہ بوقت ضرورت کام آسکیں۔ یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کی نئی کتاب کا مطالعہ کرتے تھے اور بحث طلب مسائل پر گفتگو بھی۔

دونوں حضرات کے درمیان صرف ادبی دوستی ہی نہیں تھی بلکہ جذبۂ احترام بھی تھا، اس کے نشانات خاں صاحب کے اکثر مکتوبات میں نظر آتے ہیں، اس کے لیے ۲۸/ستمبر ۱۹۹۹ء کے مکتوب کا

متن پیش کیا جارہا ہے:

”مکرمی! آداب

خط ملا تھا۔ ارادہ تھا اتوار کے دن ۱۷/ اکتوبر کو لکھنؤ آنے کا۔ حنیف نقوی سے فون پر بات بھی کر لی تھی۔ اب جو آپ کا خط ملا، جس میں آپ نے از راہ لطف خاص مجھے اس کی اجازت دی ہے کہ میں ۱۲/ اکتوبر کو سیالدہ اکسپریس کے آنے کے وقت شاہ جہان پور کے اسٹیشن پر آپ سے مل سکتا ہوں، تو اب کاہلی نے اس پر آمادہ کر لیا ہے کہ ۱۲/ اکتوبر کو یہیں اسٹیشن پر آپ سے نیاز حاصل کر لوں۔ ملاقات اصل چیز ہے، وہ دو منٹ کی ہو یا دو گھنٹے کی۔ لکھنؤ آتا، تب بھی گھنٹے دو گھنٹے سے زیادہ نہ بیٹھ پاتا۔ کچھ کمزوری ارادے میں یوں بھی آئی کہ ۱۸/ کو دسہرا ہے، آجکل جو حالات ہیں، ان میں کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ کب کیا ہوگا اس لیے آپ اب مجھے اس کی اجازت دیجیے کہ میں ۱۲/ اکتوبر کو یہیں اسٹیشن پر آپ سے مل لوں۔ یہ بہت ناتمام ملاقات ہوگی، مگر نہ ہونے سے بہرحال بہتر ہے“۔ (ایضاً، ص ۱۹۔۸۱۸)

خاں صاحب وقت مقررہ پر اسٹیشن پہنچ گئے، مگر جین صاحب نہ آئے، گاڑی بھی لیٹ تھی۔ اس کا ذکر ۱۴/ اکتوبر ۱۹۹۹ء والے خط میں یوں کرتے ہیں:

”ابھی آپ کا خط ملا، جی ہاں میں ساڑھے نو بجے رات تک اسٹیشن پر رہا۔ گاڑی لیٹ تھی، پھر میں نے لکھنؤ فون کیا، گھنٹی بجتی رہی، کسی نے اٹھایا ہی نہیں، یہ ٹونک ہاؤس کی بات ہے، پھر میں نے اندرا نگر فون کیا، ان سے رابطہ قائم ہوگیا، انھوں نے بیگم صاحبہ کا احوال بتایا اور یہ بھی کہا کہ اس وقت وہ مظفر نگر میں ہیں۔ اب آپ کے خط سے تفصیل معلوم ہوئی، اتفاقات انہی کا نام ہے۔ توقع کرتا ہوں کہ بیگم صاحبہ جلد ہی ٹھیک ہوجائیں گی۔ مزید توقع کرتا ہوں کہ یہ خط بھی آپ کو بروقت مل جائے گا۔

آپ سے ملاقات نہ ہو پانے کا بہت قلق ہے۔ خیر، یہ بھی سہی، اتفاقات ہیں زمانے کے۔ سحر البیان کی کتابت مکمل ہوگئی، تصحیح بھی بن گئی، اب چار چھ مہینے میں چھپ بھی جائے گی۔ میں نے ایک گستاخی کی ہے، خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم!

اس کتاب کو آپ کی نذر کیا ہے آپ کی اجازت کے بغیر، اگرچہ کتاب اس قابل نہیں،
خیر، کتاب کم درجہ ہے تو ہو، انتساب کے پیچھے جو جذبہ ہے، وہ کم عیار نہیں، اسی بنا پر
توقع ہے کہ کتاب کے بجائے جذبہ انتساب پر نظر رہے گی''۔ (ایضاً ص ۸۱۹)

۲۸؍ستمبر ۱۹۹۹ء والے خط میں آپ نے دیکھا کہ خاں صاحب شاہ جہاں پور ریلوے اسٹیشن پر جین صاحب سے ملنا چاہتے ہیں، چاہے وہ ملاقات دو منٹ ہی کی کیوں نہ ہو۔ جذبۂ احترام انہیں اسٹیشن لے آتا ہے، وہاں وہ جین صاحب کا انتظار کرتے ہیں۔ گاڑی لیٹ ہے، پھر بھی ٹرین کے گزر جانے تک وہ اسٹیشن پر انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ۷۴ برس کا شخص جو کئی بیماریوں میں مبتلا ہے، چلنے پھرنے سے قاصر ہے، دل کے حملے کو دو بار جھیل چکا ہے، پھر بھی ملنے کے لیے بیتاب ہے۔ وہ جین صاحب کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہے، صرف ایک بات کرنا چاہتا ہے۔ مایوس ہو کر لوٹنے سے قبل وہ ان کے گھر فون کرتا ہے، جواب ندارد دوسری جگہ کرتا ہے وہاں رابطہ قائم ہوتا ہے تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بیگم صاحبہ کی طبیعت خراب ہے اور وہ مظفر نگر میں ہیں۔ ۱۴؍اکتوبر کے خط میں لکھتے ہیں ''آپ سے ملاقات نہ ہو پانے کا بہت قلق ہے''۔

اس جذبے اور اس رشتے کا ہم کیا نام دے سکتے ہیں؟ ادبی لحاظ سے دونوں ایک بلند مقام پر فائز ہیں۔ مذہبی لحاظ سے دونوں الگ الگ مذہب کے ماننے والے ہیں۔ یہاں دونوں میں ایک بات مشترک ہے اور وہ ہے کہ دونوں خدا کو نہیں مانتے۔

دونوں کی ادبی زندگی اور نجی زندگی کے مطالعے سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں، وہ یہ ہے کہ دونوں قدیم ہندوستانی تہذیب کی روایت کے امین تھے۔ دونوں نجی زندگی میں بھی ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ ادبی اختلافات اپنی جگہ، دونوں ایک دوسرے کی کمیوں پر گرفت کرتے تھے، لیکن حد اعتدال سے آگے نہیں بڑھ پاتے تھے۔

جین صاحب (۱۹ ستمبر ۱۹۲۳ء) خاں صاحب (۲۵؍دسمبر ۱۹۲۵ء) سے قریب دو سال قبل اس فانی دنیا میں وارد ہوئے اور ان (۲۶ فروری ۲۰۰۶ء) سے ڈیڑھ سال (۱۸؍اگست ۲۰۰۷ء) بعد رخصت ہوئے۔

''الفاروق کی اسلوبیاتی قرأت''

جناب محمد لطیف

الفاروق (۸؍جنوری ۱۸۹۹ء) میں اس عظیم صاحب کردار شخصیت کو موضوع بنایا گیا ہے جنہیں دنیا حضرت عمر بن خطابؓ کے اسمِ گرامی سے جانتی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے اس تالیف کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے، حصہ اوّل میں فنِ تاریخ سے متعلق مختصر بنیادی نکات کا ذکر ہے اور تین ذیلی ابواب (الفاروق از علامہ شبلی نعمانی، مکتبہ اسلامیہ لاہور، ۲۰۰۵ء) میں صاحبِ سوانح کی حیات، سیرت، شخصیت اور اہم حالات پر مدلل بحث کی ہے۔ حصہ دوم میں اٹھارہ ذیلی ابواب مثلاً فتوحات پر ایک اجمالی نگاہ، نظامِ حکومت، صیغۂ محاصل (خراج)، صیغۂ فوج، سیاست و تدبیر عدل و انصاف وغیرہ کے تحت صاحبِ سوانح کا جمالی، جلالی، مثالی، علمی، مذہبی، معاشرتی، تہذیبی، تمدنی، قرآنی، انصافی، تعلیمی، عظیم انسانی، اور عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مملو و مغلوب کردار کو تمام تر خصائل و شمائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

جہاں اس کتاب کو شہرت دوام بخشنے میں موضوع اور صاحبِ سوانح کے انتخاب کا سب سے بڑا عمل دخل رہا ہے تو وہیں اس کی اہمیت اور عظمت کو جلا بخشنے میں سوانح نگار کے اسلوبِ نگارش نے اپنا حق ادا کیا ہے۔ یہ متن اپنے اندر گوناگوں اسلوبی خصائص (Stylistic Features) رکھتا ہے، جن میں ساختی متوازیت (Parrallelism Constructional)، ربط و تسلسل (Cohesion and Coherence)، تکرار (Repetition)، معنوی ہم آہنگی (Semantic Compatibility)، تجنیس صوتی Alliteration، کوڈ مکسنگ اور کوڈ سوچنگ Code-mixing and Code-switching، سیاق و سباق (Context)، مذہبی اسلوب، تاریخی اسلوب، وغیرہ قابلِ ذکر ہیں، اسلوب کے ان ہی انسلاکات

ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف کشمیر، سری نگر، موبائل: ۹۷۹۷۱۳۰۹۰۷۔

کے تحت زیر بحث متن کا معروضی، تجزیاتی اور توضیحی مطالعہ اختصار کے ساتھ پیش ہے۔

ا۔ مذہبی اسلوب اور مذہبی لفظیات کا بہترین استعمال: ہر زبان میں مختلف النوع لفظیات ہوتی ہیں جو متنوع مذاہب، اشیا، علوم وغیرہ کی غمازی کرتی ہیں۔ مثلاً جنت، جہنم، قرآن، حدیث، خضر، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، اللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، نماز، روزہ، زکوۃ، حج، سنت، نعت وغیرہ اسلامی لفظیات (Lexicons) ہیں، ایسے ہی رادھا، کرشنا، سرسوتی، پاروتی، چرن، پرشاد، وغیرہ ہندو مذہبیات کی لفظیات ہیں۔ یہ اب موضوع پر منحصر ہوتا ہے کہ زبان کے کس لفظیاتی قبیلے سے مصنف کو رشتہ استوار کرنا ہوتا ہے اور کن الفاظ کو کھنگال کر استعمال میں لانا ہوتا ہے، یہیں سے مصنف کی عالمانہ اور محققانہ بصیرت تحریر میں جان پیدا کر دیتی ہے، نیز زبان کا انتخاب اس زبان سے واقفیت کی بنیادوں پر کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے جب شبلی کے اسلوب کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو ان کے یہاں اسلامی مذہبیات کی لفظیات کا پرتو اس متن کی ابتدا سے آخر تک بہترین ڈھنگ سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ لفظیات شبلی کے ہی لیے ہے۔

> ”فلسطین کے قاضی عبادہ بن الصامتؓ تھے جو منجملہ ان پانچ شخصوں کے ہیں جنھوں نے رسول للہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں تمام قرآن مجید حفظ کیا تھا اور اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اہل صفہ کی تعلیم سپرد کی تھی۔ حضرت عمرؓ ان کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ جب امیر معاویہؓ نے ان کے ساتھ ایک موقع پر مخالفت کی تو حضرت عمرؓ نے ان کو امیر معاویہؓ کی ماتحتی سے الگ کر لیا۔“(۱)

۲۔ ساختی متوازیت (Constructional Parallelism):

یہ ایک اسلوبی خصوصیت ہے۔ جس کا ظہور تشکیلِ متن (Construction of Text) کے دوران ہوتا ہے۔ کسی جملے میں فقرات کی مساوات یا جملوں کی مساوات یا پھر حروف کی مساوات پائی جائے۔ پھر چاہے وہ نحویاتی (Syntactically) ہو، صوتیاتی ہو (Phonetically) ہو یا پھر معنیاتی (Semantically) ہو۔ اس کو ساختی متوازیت کہا جاتا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مختصر طور پر لیکن جامع انداز میں جوفری (Geoffrey N.Leech) اور میخائل۔ ایچ۔ شورٹ (Michael H.Shart) اپنی مشترکہ کتاب ”اسٹائل ان فکشن“ (Style of Fiction) میں لکھتے ہیں:

"The Parallelisms are indentified as structural repetitions in which variable elements occur."(2)

متوازیت کسی بھی جملے میں جزوی (Partial) طور بھی ہوسکتی ہے اور جملوں کے درمیان کلی (Total) طور پر بھی ہوسکتی ہے۔اس سے تحریر میں ایک آہنگ اور توازن Rhythm and Balance پیدا ہوتا ہے۔علامہ شبلی نعمانی کے اسلوب کی یہ اور ایک بڑی خصوصیت ہے۔الفاروق کے اوراق میں یہ اسلوبیاتی خاصیت بار بار دیکھنے کو ملتی ہے،اس سے نہ صرف تحریر کی جاذبیت اور لذت میں اضافہ ہوا ہے بلکہ جملوں کی ساخت میں Segementation کا عنصر بھی خود بخود پیدا ہوا ہے۔مذکورہ کتاب میں یہ وصف لفظی اور معنیاتی دونوں اعتبار سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ملاحظہ ہوں چند مثالیں:

> ''تعلقات کی وسعت اور کام کے پھیلاؤ سے ان لوگوں کے کاروبار کے مختلف صیغے پیدا ہو گئے تھے اور ہر صیغے کا اہتمام جدا تھا۔مثلاً خانہ کعبہ کی نگرانی،حجاج کی خبر گیری، سفارت،شیوخ قبائل کا انتخاب،فصل مقدمات،مجلس شوریٰ وغیرہ وغیرہ۔''(۳)

> ''حالانکہ ہمارا بادشاہ سب سے بڑا بادشاہ ہے اور تعداد میں ہم آسمان کے ستاروں اور زمین کے ذروں کے برابر ہیں۔''(۴)

مذکورہ مثالوں میں 'تعلقات کی وسعت' اور 'کام کے پھیلاؤ' اور 'خانہ کعبہ کی نگرانی' اور 'حجاج کی خبر گیری' فقرات کے درمیان ایک قسم کی معنوی مطابقت ہے۔اسی طرح ''آسمان کے ستاروں اور زمین کے ذروں'' کے درمیان قواعدی مطابقت پائی جاتی ہے،اس نوع کی بیسیوں مثالیں ''الفاروق'' میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

۳۔محاکاتی اسلوب: کسی بھی جگہ،حالت،حادثہ،منظر،ماحول وغیرہ کی تصویر لفظوں کے ذریعہ کھینچنے کو محاکات کہتے ہیں۔علامہ شبلی اس کے بہت بڑے دلدادہ تھے جس کی غمازی ان کی تصنیف ''شعر العجم'' سے بھی ہوتی ہے،یہ ان کے اسلوب کی بڑی خاصیت ہے۔''الفاروق'' میں اپنے موضوع کے حوالے سے یہ وصف اکثر غزوات،نئی بستیاں آباد کرنے اور امورِ خلافت کے مناظر اور تیاریوں کے ذکر میں سامنے آیا ہے۔شبلی نے لفظیات کا انتخاب بھی کچھ اس ڈھنگ سے کیا ہے کہ سارا منظر اپنی معنوی جہات کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔جو جوش و جذبہ کے ساتھ علمیت و اثر بھی اپنے اندر

رکھتا ہے۔ جیسے:

”غرض دو پہر ڈھلی تو نعمانؓ نے دستور کے موافق تین نعرے مارے پہلے نعرہ پر فوج ساز و سامان سے درست ہوگئی دوسرے پر لوگوں نے تلواریں تول لیں، تیسرے پر دفعتہً حملہ کیا اور اس بے جگری سے ٹوٹ کر گرے کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ میدان میں اس قدر خون بہا کہ گھوڑوں کے پاؤں پھسل پھسل جاتے تھے چنانچہ نعمانؓ کا گھوڑا پھسل کر گرا، ساتھ ہی خود بھی گرے اور زخموں سے چور ہو گئے۔“(۵)

”......اور بڑے بڑے اکابر صحابہؓ شریک تھے یہ مسجد ۵۰ گز لمبی اور ۳۰ گز چوڑی تھی۔ تین طرف دروازے تھے جن میں سے ایک دارالحکومت کے مقابل تھا اور عمارتوں میں سات سات گز کا فاصلہ تھا۔“(۶)

۴۔ کوڈ مکسنگ اور کوڈ سوئچنگ (Code-Mixing and Code-Switching): مادری زبان یا بنیادی اظہارِ زبان (Basic Medium of Language) کے علاوہ اپنی تحریر میں اور کسی زبان کے الفاظ، فقرات اور جملے استعمال میں لانا کوڈ مکسنگ اور کوڈ سوئچنگ کا عمل کہلاتا ہے۔ معاصر اردو ادب میں دیگر زبانوں کے استعمال کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر انگریزی زبان کی شہرت کو مدِ نظر رکھ کر ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات و نگارشات میں اس زبان کا دل کھول کر استعمال کیا ہے۔ گذشتہ دو تین دہوں سے اردو کے شعرا و ادبا نے انگریزی زبان کی لفظیات کا بار بار استعمال کیا ہے۔ یہاں ہمیں یہ طریقہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ جن انگریزی الفاظ کے اردو مترادفات موجود ہیں۔ ان کا بھی استعمال کئی جگہوں پر انگریزی کے رسم الخط میں کیا گیا ہے جو سراسر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ہمارے ادیب روز بروز انگریزی زبان و ادبیات سے زیادہ اثر قبول کرتے جاتے ہیں، جو شاید اردو زبان کے لیے مفید بھی ہے اور نقصان دہ بھی۔ لیکن اس ضمن میں علامہ شبلی ایک ایسے مصنف ہیں جن کی تخلیقی نگارشات میں انگریزی الفاظ کا استعمال گویا نہیں کے برابر ہے۔ یہ بات بھی بدیہی ہے کہ اردو زبان و ادب کی نوک پلک کو سنوارنے اور اس میں لطف و حلاوت پیدا کرنے میں عربی اور فارسی زبان و ادبیات کا بڑا حصہ ہے۔ یعنی ان زبانوں کے درمیان روز اوّل سے ایک جزو لاینفک کا رشتہ رہا ہے۔ علامہ شبلی نے ”الفاروق“ میں عربی اور فارسی زبانوں کا وسیلہ لے کر جملوں کی ساخت میں لفظوں اور

فقروں کا استعمال عبارت کے سیاق وسباق (Context) کے عین مطابق کیا ہے۔ بالخصوص عربی زبان کے جملوں کے استعمال سے "الفاروق" کے موادو ہیئت کی زینت وزیبائش میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس طرح یہ عمل بھی علامہ شبلی کے یہاں ایک بڑی اسلوبی خصوصیت ہے۔ پوری کتاب میں جا بجا علامہ شبلی نے پوری مہارت سے کوڈ مکسنگ اور کوڈ سوئچنگ کا استعمال کیا ہے، اس میں قرآنی آیات، احادیث، اشعار اور اقوال شامل ہیں، جیسے:

الف، آیاتِ قرآنی: جملوں کی ساخت میں علامہ شبلی نے قرآنی آیات کا استعمال نہایت عالمانہ انداز سے کیا ہے۔

"خطبہ کے بعد خیمہ میں آئے تو بیٹے کو بیمار پایا' نہایت استقلال کے ساتھ کہا: یٰبُنَیَّ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ "یعنی اے فرزند! یہ اللہ کی طرف سے ہے دیکھ شبہ میں نہ پڑنا۔" بیٹے نے جواب دیا: سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ یعنی "اللہ نے چاہا تو آپ مجھ کو صابر پائیں گے۔" (۷)

ب، احادیث مبارکہ:

"صفوان بنِ سلیم کا قول ہے: لَمْ یَكُنْ یُفْتِیْ فِیْ زَمَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ غَیْرَ عُمَرَ وَ عَلِیٍّ وَمَعَاذٍ وَاَبِیْ مُوْسٰی۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صرف چار شخص فتویٰ دیتے تھے عمرؓ، علیؓ، معاذؓ، اور ابو موسیٰؓ۔" (۸)

ج۔

"اَرَبًّا وَّاحِدًا اَمْ اَلْفَ رَبٍّ — ایک خدا کو مانوں یا ہزاروں کو؟
اَدِیْنُ اِذَا تَقَسَّمَتِ الْاُمُوْرُ — جب کہ امور تقسیم ہو گئے۔
تَرَكْتُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰی جَمِیْعاً — میں نے لات اور عزیٰ (بتوں کے نام) سب
كَذٰلِكَ یَفْعَلُ الرَّجُلُ الْبَصِیْرُ — کو خیر باد کہا اور سمجھ دار آدمی ایسا ہی کرتا ہے۔" (۹)

۵۔ شماریت (Enumeration): شماریت دراصل بیان کا ایک طرزِ اظہار ہے جس میں مختلف قریب المعنی / المبنی / التابع الفاظ، اشیا یا افعال کو ایک ایک کر کے جمع کیا جاتا ہے۔ جس سے عبارت میں ایک قسم کی لفظیاتی زنجیر (Lexical Chain) سی بن جاتی ہے اور جملوں کی نحوی ساخت پر بھی کوئی

فرق نہیں پڑتا ہے۔اس سے اظہار احساس اور طرزِ بیان کی سادگی، سلاست، روانی اور رنگینی بھی برقرار رہتی ہے۔"الفاروق" میں یہ اسلوبی خصوصیت صرفیات (Morphology)، نحویات (Sytaxical) اور معنیات (Semantical) ہر اعتبار سے دیکھنے کو ملتی ہے۔یہاں علامہ شبلیؒ نے جس زمرے میں شماریت کو زیادہ برتا ہے وہ اسمائیہ شماریت ہی ہے۔جس میں صحابہؓ، مختلف ممالک، اشیا اور اقوام کے اسما شامل ہیں، جیسے:

"تمام صحابہؓ میں اس وقت چھ شخص تھے جن پر انتخاب کی نگاہ پڑ سکتی تھی: علیؓ، عثمانؓ، زبیرؓ، طلحہؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، لیکن حضرت عمرؓ ان سب میں کچھ نہ کچھ کمی پاتے تھے اور اس کا انھوں نے مختلف موقعوں پر اظہار بھی کر دیا تھا۔"(۱۰)

"جو قبیلے آباد کیے گئے ان میں یمن کے بارہ ہزار اور نزار کے آٹھ ہزار آدمی تھے اور قبائل آباد کیے گئے، ان کے نام حسبِ ذیل ہیں: سلیم، ثقیف، ہمدان، بجیلہ، یتم اللات، تغلب، بنو اسد، نخع و کندۃ، ازد، مزنیہ، تمیم ومحارب، اسد و عامر، بجالتہ جدیلتہ واخلاط، جہینہ، مذحج، ہوازن وغیرہ وغیرہ۔"(۱۱)

۶۔تکرار (**Repetition**): یوں تو ہر کسی متن میں کسی نہ کسی طرح تکرار کی صورت ضرور دکھائی دیتی ہے، مثلاً لفظی تکرار (Word Repetition)، فقرۂ تکرار (Pharse Repetition)، جملوں کی تکرار (Sentence Repetition)، معنوی تکرار (Semantical Repetition)، متضاد تکرار (Antonymical Repeition)، موضوعی تکرار (Thematical Repeition) استفہامیہ تکرار (Question Formation Repetition) وغیرہ جن سے کرداروں کی نفسیات، جذبات، ذوق و شوق، موضوع کے کسی پہلو کی اہمیت، الفاظ کے کسی قبیلے (Lexical Registers) سے مصنف کی دلچسپی وغیرہ کی کیفیت اور اہمیت وعظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔اور متن کے تجمعی خیال Summative Theme کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔"الفاروق" میں جا بجا اس خوبی سے تعارف ہوتا ہے جس میں اسمیہ، فعلیہ، صفتیہ، یک لفظی، ذولفظی اور فقرۂ تکرار بھی شامل ہیں۔جیسے:

(الف) یک لفظی تکرار کے ساتھ فعل کی تصریفی صورتیں:

"بیماری کی حالت یکساں نہ تھی، کبھی بخار کی شدت ہو جاتی تھی اور کبھی اس قدر

افاقہ ہوجاتا تھا کہ مسجد میں نماز ادا کرتے تھے، یہاں تک کہ عین وفات کے دن نمازِ فجر کے وقت طبیعت اس قدر بحال تھی......"(۱۲)

(ب) تکرارِ ضمائر:

"اگر میں اسی طرح تمہارا کام کروں کہ تم چین سے گھروں میں سوؤ تو عین سعادت ہے اور اگر یہ میری خواہش ہو کہ تم میرے دروازے پر حاضری دو تو میری بدبختی ہے، میں تم کو تعلیم دینا چاہتا ہوں لیکن قول سے نہیں بلکہ فعل سے۔"(۱۳)

(ج) یک لفظی تکرار بشمول معنوی مطابقت:

"حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ نوشیروان کے ملبوسات اس کو لاکر پہنائے جائیں، یہ ملبوسات مختلف حالتوں کے تھے، سواری کا جدا، دربار کا جدا، جشن کا جدا، تہنیت کا جدا، چنانچہ باری باری تمام ملبوسات محلم کو پہنائے گئے۔(۱۴)

مذکورہ اقتباسات میں الفاظ کی تکراری کیفیت ملتی ہے۔ مثلاً متن کی ساخت اور بنت میں لذت، چاشنی اور دلکشی کے آہنگ کو برقرار رکھنے کے لیے ضمائر کا تواتر استعمال، بیمار، افاقہ، بخار، وفات، ملبوسات، پہنانے، جشن، تہنیت وغیرہ میں معنوی مطابقت کا حسین امتزاج وغیرہ۔

غرض علامہ شبلی نعمانی کی تحقیقی، تنقیدی، سوانحی، تاریخی اور شاعری تخلیقات و نگارشات کو نہ صرف مواد و موضوع کی وجہ سے اہمیت و عظمت حاصل ہے، بلکہ اس میں زبان کی کیفیت کا ان کی شہرتِ دوام میں بڑا حصہ ہے۔

حواشی

(۱) علامہ شبلی نعمانی۔ الفاروق، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۲۰۳۔ (۲) Style in fiction, by Geoffrey N.Leech and Micheal H-Short, Longman, London and New York 1981P-142

(۳) علامہ شبلی نعمانی، الفاروق، مکتبہ اسلامیہ، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۳۵۔ (۴) ایضاً، ص ۱۰۶۔ (۵) ایضاً، ص ۱۳۸۔ (۶) ایضاً، ص ۲۱۹۔ (۷) ایضاً، ص ۳۶۔ (۸) ایضاً، ص ۱۲۸۔ (۹) ایضاً، ص ۳۲۲۔ (۱۰) ایضاً، ص ۱۵۴۔ (۱۱) ایضاً، ص ۲۱۸۔ (۱۲) ایضاً، ص ۶۰۔ (۱۳) ایضاً، ص ۹۷۔ (۱۴) ایضاً، ص ۱۰۱۔

بابــــ الفتاویٰ

مسجد میں بیسمنٹ (Base-Ment)

جناب راجو خان

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیانِ شرعِ متین درج ذیل مسئلے کے بارے میں:

میرے گاؤں میں ایک قدیم طرز کی مسجد تھی جو بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے ناکافی ہورہی تھی نیز لبِ سڑک واقع ہونے کی وجہ سے سرکار کے روزافزوں سڑک توسیع وتصعید منصوبے کے سبب نشیب میں جارہی تھی، چنانچہ گاؤں کے رہنے والوں نے ایک نشست منعقد کی جس میں اس مسئلے کو زیر بحث لایا گیا، بالآخر ۱۵/ارکان پر مشتمل ایک مسجد تعمیر کمیٹی تشکیل دی گئی، سردست ارکان کے اسمائے گرامی کے اندراج سے دامن کشاں گزرتا ہوں۔

بہرکیف باشندگان محلہ کے مشورے اور فیصلے کے مطابق اس نوتشکیل شدہ کمیٹی کے ذریعے مسجد کو شہید کرکے اس کے نیچے والے حصے کو بیس منٹ (Base-Ment) بناکر مدرسہ اور دیگر متعلقہ ضروریات وضوخانہ، استنجا خانہ، بیت الخلا، امام صاحب کا حجرہ اور آنے والی جماعت کے لیے قیام و طعام گاہ کی تعمیر کی نیت کے ساتھ اس کا نقشہ تیار کیا گیا اور اس کے بعد تعمیراتی کام شروع کردیا گیا۔

واضح رہے کہ مذکورہ ضروریات کی تکمیل کے لیے اس کے علاوہ کوئی دوسری جگہ بھی نہیں ہے اور ساکنانِ قریہ کی بہ استثنائے چند اقتصادی ابتری ومعاشی خستگی نئی زمین کی خریداری وفراہمی کی متحمل بھی نہیں ہے۔

بہرطور جاری تعمیری کام کے پیش نظر عارضی طور پر بیس منٹ والے حصے میں ہی نماز کی ادائیگی عمل میں آرہی تھی، جب نقشے کے مطابق مسجد بن کر تیار ہوگئی تو چند لوگ بربنائے تعصب اور اختلاف کے اسی بیس منٹ والے حصے میں ہی نماز پڑھنے پر مصر ہیں اور انہی لوگوں نے بعض امور کی صراحت اور بعض کی عدم صراحت پر مبنی استفتاء کے ذریعے اس بابت فتویٰ بھی منگوالیا ہے۔

پیش نظر فتویٰ میں بیان کردہ شریعت کے مسلمہ اصول سے کسی کو بھی مجال انکار نہیں، لیکن اسی

بیگوسرائے، بہار۔

شریعت غرّ ااور ملت بیضا کا اشباہ نظائر سے بھی علاقہ ہے، جس کی اس میں کمی ہے۔ ملک عزیز ہندوستان جنت نشان میں اس طرز پر تعمیر کردہ سیکڑوں مسجدوں کی تمثیل سے صرف نظر کرتے ہوئے اس جاری فتویٰ سے مسئلہ سلجھنے کے اور الجھتا جارہا ہے، لوگ دو خیموں میں منقسم ہیں، فضا مکدر ہے، سرد جنگ کا ماحول ہے، چہ میگوئیوں کا بازار گرم ہے، عوام آپس میں متحارب اور متصادم ہیں، ایک بار تو زبردست ٹکراؤ کی نوبت بھی آ گئی لیکن اسے کسی طرح دبا دیا گیا مگر خاکستر میں دبی ہوئی یہ چنگاری کبھی بھی شعلۂ جوالہ بن سکتی ہے، اس صورت حال پر نہ چاہتے ہوئے بھی علامہ اقبال کا یہ شعر نوک قلم پر لانا پڑتا ہے:

نہ جانے کتنے سفینے ڈبو چکی اب تک فقیہ و صوفی و ملا کی ناخوش اندیشی

نو تشکیل شدہ کمیٹی کا کہنا ہے کہ مسجد کی تحدید میں نیت کا اعتبار کیا جاتا ہے اور اہم ارکان کمیٹی نے شہید کرتے وقت اپنے مذکورہ بالا عزائم کا اظہار کر کے ہی اس کام کو ہاتھ لگایا تھا، علاوہ ازیں ''ہیئت کے بدل جانے سے حکم بدل جاتا ہے'' والا شرعی اصول ہمارے پیش نظر ہے۔

توجہ طلب امر یہ ہے کہ شریعت کے فراہم کردہ ان دونوں رہ نما خطوط کا اطلاق مسجد کی پہلی تعمیر سے متعلق ہے یا پھر اس کی تحدید کو بھی محیط ہے؟ کیوں کہ :

برکفے جامِ شریعت وبرکفے سندانِ عشق ہرہوس نہ داند جام و سندانِ باختن

اب اگر بیس منٹ میں مٹی بھرائی کی جاتی ہے تو صرف کثیر اور اچھی خاصی جگہ سے محرومی اور اگر اسی کو سجدہ گاہ بناتے تو بغیر نقشے کے مکان یا مکین ہونے کا ثبوت دیتے ہیں، علاوہ ازیں نماز کی ادائیگی کو منتظر تیار مسجد اور ہمارے سجدوں کو ترستے ہوئے اس کے منبر و محراب کا دلخراش منظر پیش کرتے ہیں جو طعنہ وخندہ زنی کی سند جواز فراہم کرے گا، اس بے بسی و بے کسی کے عالم میں سوائے اس کے کیا کہا جائے :

صوفیا مستند و زاہد بے خبر از کہ پرسم من رہِ مے خانہ را

اس عرض عارض کی وجہ سے دوسرے متعلقہ مذکورہ بالا تعمیری سلسلے ہنوز موقوف ہیں، سب سے جان لیوا اور روح فرسا امر استنجا خانے کا معقول عدم انتظام ہے جس پر کسی کے ماتھے میں جوں تک نہیں رینگتی، شریف اور غریب ذی علم کے لیے اس معاملے میں خون کے آنسو بہانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، اس لیے علامہ شبلی کے حسین خوابوں کی تعبیر دار المصنّفین اور اس کے ماہوار علمی رسالہ معارف جو کہ اسم با مسمیٰ ہے، سے رجوع کر رہا ہوں، کیوں کہ یہ صرف معارف پروری اور ادب نوازی تک ہی

محدود نہیں بلکہ ملک وملت کے مسائل سے بھی اس کا سروکار رہا ہے، گردش ایام، رفتار زمانہ اور انقلاب دہر نے اس شغف اور انہماک میں بھی کوئی کمی نہ ہونے دی۔

کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک مخصوص ماحول میں رہنے کے باوجود وابستگان دارالمصنّفین امت کے واقعی مسائل سے پہلوتہی نہیں کی ہے اور مشکلات کو حل کرنے میں کوتاہی سے کام نہیں لیا ہے نیز وہ ملت کے لیے فکر منداور مضطرب نہ ہوتے ہوں، حالات کے سردوگرم کا چشیدہ ہوتے ہوئے بھی پر عزم وحوصلہ ہوکر آئندہ کے لیے اقبال کے اس حقیقت افروز اور معنی خیز شعر کے ذریعے وہ یہ پیغام ضرور دیتے رہے کہ :

شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا پردم ہے، گرتو، تو نہیں خطرۂ افتاد

آمدم برسر مطلب بھیا نک انجام کا پیش خیمہ ثابت ہونے والا یہ ناخوشگوار ماحول اس تصویر کے بدلے جانے کا ہم سے متقاضی ہے،اس لیے اس ماحول میں رہ رہے ہم لوگ مودبانہ التماس کرتے ہیں کہ مسئلے کے مالہ وماعلیہ حقائق وکنہیات اور مضمرات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں مزید تقسیم در تقسیم کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے اس کا شرعی حل نکال کر عنداللہ ماجور اور عندناس مشکور ہوں۔

ا۔فتویٰ کی نقل

’’جس جگہ ایک مرتبہ مسجد بن جاتی ہے وہ جگہ تاقیامت مسجد کے حکم میں رہتی ہے،اس جگہ کو مسجد کے علاوہ دوسرے کام میں استعمال کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔لہٰذا صورت مسئولہ میں جب کہ مذکورہ موقوفہ زمین جس پر مسجد تعمیر ہوگئی اور نماز باجماعت ہوتی رہی،اب اس کو شہید کرکے نئی تعمیر میں دوسری منزل پر نماز پڑھنا اور پہلی منزل کو بچوں کی تعلیم اور جماعت والوں کے ٹھہرانے یا اس کے علاوہ دوسرے کام کے لیے مخصوص کرنا شرعاً جائز نہیں ہے،دونوں منزلوں کو نماز ہی کے لیے رکھا جائے‘‘۔

’’ولو حزب ماحوله واستغنى عنه يبقى مسجداً عند الامام والثانى أبداً إلى قيام الساعة وبه يفتىٰ‘‘(الدر المختار على صدو رد المختار ۶/۵۴۸)

فقط جویائے خیر

(جناب ـــــ)راجوخان

نوٹ : صاحبانِ افتا کے مطالعہ اور ان کی رائے کی غرض سے یہ تحریر دی گئی ہے۔

اخبار علمیہ

''ڈھائی ہزار سال قدیم زیورات کی دریافت''

سویڈن میں ایک نقشہ نویس تھامس کارلسن کو جنگل کے سروے کے دوران کانسہ دور کے زیورات ملے ہیں جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ڈھائی ہزار سال پرانے ہیں، دریافت شدہ زیورات میں ہار، کڑے اور لباس پر لگائی جانے والی پن شامل ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ نے اس قسم کے ذخیرہ کی دریافت کو غیر معمولی بتایا ہے اور کہا ہے کہ قدیم زمانے میں قبائل ایسی اشیا کو دریا کے کناروں یا کھلے میدانوں میں چھوڑ دیتے تھے، یہ تمام اشیا گوتھنبگ کے قریبی جنگل ایلنگساس کی ایک چٹان کے قریب زمین میں پڑی ہوئی ملی ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ قیمتی زیورات اور اشیا ۷۵۰ سے ۵۰۰ قبل مسیح کے دوران کی ہیں اور انہیں دیوی، دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے جان بوجھ کر وہاں رکھا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے طویل عرصہ کے باوجود یہ وہاں محفوظ رہے اور یہ کسی صاحب حیثیت یا امیر ترین عورت کے تھے۔ سویڈن کے قانون کے مطابق کسی شخص کو ایسی نادر اشیا ملتی ہیں تو لازم ہے کہ وہ مقامی پولیس یا حکام کو مطلع کرے، کیونکہ بنیادی طور پر یہ ریاست کی ملکیت ہوتی ہیں۔ البتہ سویڈش بورڈ اپنی صواب دید پر ڈھونڈنے والے شخص کے لیے کوئی انعام مقرر کرسکتا ہے۔ آثار قدیمہ کی ماہر پرنیلا مورنر کا کہنا ہے کہ سکارایوگ میں ۱۹۸۰ء میں کانسہ کی تلواروں کی دریافت کے بعد اب تک ایسی بڑی دریافت نہیں ہوئی تھی۔ (بی بی سی اردو ڈاٹ کام، ۱ر مئی ۲۰۲۱ء، ص ورلڈ)

''مسجد سلمان بن عبدالعزیز''

پاکستانی وزیر اعظم کے خصوصی نمائندہ برائے مشرق وسطیٰ طاہر اشرفی نے لاہور میں نیوز کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ سعودی عرب نے فیصل مسجد کے طرز پر بین الاقوامی یونیورسٹی کے اندر ''مسجد سلمان بن العزیز'' تعمیر کرنے کی منظوری دی ہے جس میں ۱۰ ہزار مرد اور ۲ ہزار خواتین بیک وقت نماز ادا کرسکیں گی۔ اس مسجد میں جدید اسلامی تحقیقاتی مراکز بھی بنائے جائیں گے جن میں جدید علوم پر تحقیق کی جائے گی۔ سعودی سفیر نواف بن سعید المالکی کا کہنا ہے کہ اسلام آباد میں یہ جدید طرز تعمیر کی شاہ سلمان بن عبدالعزیز آل سعود مسجد، اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے عوض خادم حرمین شریفین

کی جانب سے تحفہ ہے۔(العربیہ ڈاٹ نٹ، ۱؍مئی ۲۱ء)

''اردو کے لیے ایک غیر مسلم جج کا آواز اٹھانا''

جسٹس مارکنڈے کاٹجو سپریم کورٹ کے سابق جج ہیں۔انہوں نے ہمیشہ مظلوموں کے حق میں آواز اٹھانے کی کوشش کی ہے، وہ بین الاقوامی اور قومی زبانوں انگریزی، امریکی، فرانسیسی، روسی، ہسپانوی اور ہندی، بنگالی، تمل اور اردو سے بخوبی واقف ہی نہیں بلکہ ان زبانوں میں ہونے والی شاعری کو اچھی طرح پڑھتے اور سمجھتے ہیں۔گذشتہ دنوں انہوں نے ''اردو کے ساتھ ہوئی بڑی ناانصافی کو دور کیا جائے'' کے عنوان سے ایک مضمون روز نامہ ''انقلاب'' کے گیسٹ کالم کے لیے تحریر کیا۔اس کے شروع میں لکھتے ہیں کہ میری رائے ہے کہ اردو شاعری جس انداز میں انسانی دل کی آواز بیان کرتی ہے اور جس طاقت اور وقار کے ساتھ بیان کرتی ہے وہ دنیا کی کوئی اور شاعری نہیں کرتی۔اس لحاظ سے اسے دنیا کی سب سے عظیم شاعری قرار دیا جاسکتا ہے۔تاہم ہندوستان کی آزادی اور تقسیم ہند کے بعد کچھ متعصب افراد نے اردو کو دبانے کی کوشش کی۔یہ پروپیگنڈا پوری طرح غلط تھا۔آزادی کے وقت ہندوستان کے بڑے حصہ میں تعلیم یافتہ طبقہ خواہ وہ ہندو ہو، مسلمان ہو، سکھ ہو سب کی زبان یہی تھی۔انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں ہمیشہ سے اردو کا گرویدہ رہا ہوں اور اس کی متعدد طریقے سے ترویج کی کوششوں کے ساتھ سمجھتا رہا ہوں کہ اردو پوری طرح سے ہندوستانی (دیسی) زبان ہے۔اس کے علاوہ بحیثیت جج میں نے اپنے بہت سے فیصلوں میں اردو شاعری کا حوالہ دیا۔مثلاً ارونا شان بوگ بنام یونین آف انڈیا ۲۰۱۱ء، محبوب پاشا بنام ریاست، بدھا دیو کرما کر بنام مغربی بنگال، اجیت سنگھ ہرنام سنگھ گجرال بمقابلہ ریاست مہاراشٹر وغیرہ کے فیصلوں کا آغاز میں نے اردو شاعری کے حوالہ سے کیا۔محبوب پاشا بنام ریاست جو کہ وحشیانہ طور پر حراستی موت سے متعلق تھا والے فیصلہ کا آغاز فیض احمد فیض کے اس شعر سے کیا ؎

بنے ہیں اہل ہوس، مدعی بھی منصف بھی کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

مجھے ایک دوست نے اطلاع دی کہ اس فیصلہ کی کاپی لاہور، کراچی وغیرہ کے وکیلوں میں بڑی تعداد میں تقسیم کی گئی۔اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستانی خزانہ میں چمکتے ہوئے جوہر اردو کے ساتھ ہونے والی

عظیم ناانصافی کو دور کیا جائے۔(انقلاب وارانسی، ۲۳مارچ ۲۱ء،ص ۹)

''کرونا وائرس کے خاتمہ پر نئی تحقیق''

ایک خبر کے مطابق کرونا وائرس کو بلند درجہ حرارت والے ماحول میں ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفہ کے لیے رکھا جائے تو اس سے وائرس تیزی سے تلف ہونے لگتا ہے، ٹیکساس اے اینڈ ایم یونیورسٹی کے شعبۂ ترقیات وکمپیوٹر سے وابستہ پروفیسر ایرم ہان نے یہ ثابت کیا ہے کہ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفہ کا بلند درجۂ حرارت ہوا میں پرواز کرنے والے اس وائرس کو مکمل طور پر ختم کرسکتا ہے۔ پروفیسر ایرم نے فولادی نلکی بنائی اور اس میں کرونا وائرس سے بھرپور مائع بھرا اور اسے فوری طور پر تیز گرم کیا اور اگلے لمحہ ٹھنڈا کردیا۔اس قدر کم دورانیہ کا درجۂ حرارت وائرس کو ختم کرگیا۔انہوں نے مسلسل دو ماہ تک کیے گئے اپنے نتائج سائنس دانوں کے سامنے پیش کیے ہیں۔اس طرح ۱۶۱ فارن ہائیٹ یا ۷۲ درجے سینٹی گریڈ محلول کو آدھا سیکنڈ گرم کیا جائے تو مائع میں وائرس کی تعداد ایک لاکھ گنا تک کم ہوجاتی ہے اور وائرس کا پھیلاؤ رک سکتا ہے۔ پروفیسر ایرم کے مطابق یہ ایک بہت اہم دریافت ہے۔یہ طریقہ ایئر کنڈیشننگ نظاموں اور وینٹی لیٹر کے لیے بہت مفید ہوسکتا ہے۔ساتھ ہی عین اسی درجۂ حرارت سے انفلوئنزا سمیت دیگر وائرسوں کو بھی ختم کیا جاسکتا ہے۔یہ وائرس اگرچہ کم خطرناک ہے لیکن دنیا کے لیے مشکل بنا ہوا ہے، اگلے مرحلہ میں اسی درجۂ حرارت کو ملی سیکنڈ پر لاکر اس کی افادیت نوٹ کرنے کا عزم ہے۔

(ہندوستان ممبئی، ۱/۵/۲۱ء)

''ارشاد الساری لشرح صحیح بخاری کی اشاعت''

علامہ ابوالعباس احمد بن محمد القسطلانی الشافعی کی مشہور شرح بخاری موسوم بہ ارشاد الساری ہے۔ اس کو ۲۰ جلدوں میں دار ابن حزم للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت نے عطاءات العلم کے زیرنگرانی شائع کیا ہے۔اس کے ذیل میں عجمی، عجلونی اور سندی وغیرہم کے حواشی ہیں۔اس کی تحقیق ادارہ المکتب العلمی بدرالکمال المتحدہ نے کی ہے۔یہ معلومات شائع شدہ ایڈیشن کے سرورق سے لی گئی ہیں۔

(ک۔ص۔اصلاحی)

معارف کی ڈاک

مکتوب بہار

مکرمی مدیر معارف! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ بخیر ہوں گے۔

آپ نے اپریل کے شذرات میں جن شخصیات کے لیے دعائے صحت کی اپیل کی تھی، افسوس کہ تین ہی دن کے بعد ان میں ایک ممتاز شخصیت رخصت ہوگئی، اور قوم ایک جرات مند قائد سے محروم ہوگئی، امید ہے کہ آئندہ شمارہ میں آپ کے قلم سے مولانا ولی رحمانی کا ذکر خیر آئے گا۔

دارالمصنّفین کی مطبوعات کے سلسلہ میں یہ توجہ دلائی تھی کہ اس کی عربی وفارسی عبارتوں میں اغلاط راہ پاجاتی ہیں جن کی بڑے اہتمام سے تصحیح کی ضرورت ہے، حیات شبلی میں ایک جگہ جہاں علم کلام کی بحث آئی ہے وہاں پر بیچ میں فوٹو کا لفظ لکھا ہوا ہے، میرا خیال ہے کہ وہاں پر سید صاحب نے علامہ شبلی کی اس تین سطروں کی عبارت کو درج کرنے کا ارادہ کیا ہوگا جس طرح علامہ شبلی کی کتاب الکلام کے مقدمہ کے اخیر میں سید صاحب نے خود ان ہی کی تحریر کا عکس نقل کیا ہے، اس عکس کو اس جگہ پر نقل کروادیا جائے تو بہتر ہوگا۔

علامہ کے سلسلہ میں چند شمارہ قبل الیاس اعظمی صاحب کی جو تحریر شائع ہوئی تھی اس میں جہاں ان کے دیگر علمی کاموں کے عربی تراجم کا ذکر تھا وہاں ڈاکٹر اکرم ندوی کے قلم سے سفرنامہ روم و شام کے عربی ترجمہ کا ذکر نہیں تھا حالاں کہ وہ کئی سال قبل بیروت سے چھپ کر شائع ہوگئی ہے۔علامہ شبلی کے بارے میں ایک موضوع ذہن میں تھا، یعنی ان کے یہاں ایک اصول نظر آتا ہے کہ جو روایت عظمت اور کرامت نبوت کے خلاف ہو اس کو وہ درایۃ ناقابل قبول تسلیم کرتے ہیں، اس کے اشارے ان کی تحریروں میں ملتے ہیں، یہ بہت اہم اصول ہے، ان شاءاللہ ان کی تحریروں کے حوالہ سے حسب فرصت اس پر تفصیل سے لکھوں گا۔

استھانواں، بہار شریف، بہار۔

اس سے قبل سید صاحب کے دو مضامین ارسال کر چکا ہوں، ایک ان کے ایک عربی مضمون کا اردو ترجمہ ہے اور ایک مفصل نایاب تحریر ہے۔ سید صاحب کی فارسی تحریریں عام طور پر دستیاب نہیں ہیں، ان کے دادا کا تذکرہ خود سید صاحب کے قلم سے دریافت ہوا ہے جو فارسی میں دو صفحات میں ہے اور ایک نایاب تحریر ہے، اس کو بھی ترجمہ و تمہید کے ساتھ معارف میں برائے اشاعت پیش کروں گا۔

والسلام

(جناب) طلحہ نعمت ندوی

بہار شریف

مکتوب چمپارن

(جناب) وارث ریاضی

محترم گرامی قدر! زیدت معالیکم

۱۲/اپریل ۲۰۲۱ء کی صبح میں واٹس ایپ پر معارف اپریل کا اداریہ پڑھا، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا سید محمد ولی رحمانی آئی سی یو میں داخل ہیں، تشویش ہوئی کہ ایسا نہ ہو کہ یہ چراغ بھی ہمیشہ کے لیے گل ہو جائے، اسی روز دو پہر کے بعد ناچیز کے چھوٹے بیٹے عزیزی حسان احمد نے یہ دلدوز خبر سنائی کہ انٹرنیٹ پر پڑھا ہے کہ مولانا سید محمد ولی رحمانی صاحب کا انتقال ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون، یہ خبر سن کر پیر کے نیچے سے زمین کھسک گئی ؎

فروغ شمع تو باقی رہے گا صبح محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

مولانا سید محمد ولی رحمانی (۱۹۴۳-۲۰۲۱ء) نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر اپنے والد محترم حضرت مولانا منت اللہ رحمانی (۱۹۱۳-۱۹۹۱ء) کی نگرانی میں حاصل کی، پھر جامعہ رحمانی میں تعلیم پائی، خوش قسمتی سے جامعہ رحمانی میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی (۱۹۳۶-۲۰۰۲ء) جیسا فاضل استاد مل گیا جس نے مولانا محمد ولی رحمانی کی خوابیدہ صلاحیتوں کے فروغ دینے میں نمایاں رول ادا کیا۔

جامعہ رحمانی کے بعد............تک مولانا سید ولی رحمانی دار العلوم ندوۃ العلوم ندوہ ہی میں

زیرتعلیم رہے، پھر۱۹۶۴ءمیں دارالعلوم دیوبند سے موقوف علیہ کی تعلیم حاصل کی اور ۱۹۶۵ءمیں سند فراغت کی ڈگری لی۔

مولانا مرحوم دارالعلوم دیوبند میں ناچیز موقوف علیہ اور دورۂ حدیث کے ساتھی رہے، انہیں دنوں سے مولانا رحمانی سے گہرے مراسم تھے، مولانا محمد ولی رحمانی کے والدمحترم تھے، اس انداز سے ان کی تربیت کی تھی کہ وہ طالب علمی کے زمانے میں عام طلبہ سے ممتاز رہے، لایعنی چیزوں سے انہیں سخت نفرت تھی۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد مولانا محمد ولی رحمانی نے بھاگل پور میرٹھ یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی، پھر جامعہ رحمانی میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔

۱۹۷۴ءسے ۱۹۹۶ءتک وہ بہار کونسل کے ممبر رہے، اسی دوران دو بار ڈپٹی چیئرمین کے عہدے پر بھی فائز رہے، ۱۹۹۱ءمیں مولانا ولی رحمانی اپنے والدمحترم کی وفات کے بعد آل انڈیا مسلم پرنسل لا بورڈ کے سکریٹری رہے اور پھر بورڈ کا ان کو جنرل سکریٹری بنادیا گیا۔

۲۰۱۵ءمیں حضرت مولانا سید نظام الدین امیر سادس کی وفات کے بعد حضرت مولانا سید محمد ولی رحمانی کو بہار، جھارکھنڈ واڈیشہ کا امیر شریعت منتخب کیا گیا۔

حضرت مولانا سید محمد ولی رحمانی جہاں بھی رہے اور جس عہدے پر فائز رہے وہ پوری دیانت، بصیرت، جرأت اور دل سوزی سے دین وملت اور قوم کی خدمات انجام دیتے رہے اور ۲/اپریل ۲۰۲۱ءکو اپنے مولائے حقیقی سے جاملے، اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں جگہ دے اوران کے جملہ پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے اوران کی لغزشوں کو معاف کرے۔

سوگوار

(جناب)وارث ریاضی

وفیات

مولانا محمد ولی رحمانی مرحوم

(۱۹۴۳-۲۰۲۱ء)

موت برحق ہے، اس پر کس کا ایمان نہیں لیکن اب ایک سال سے موت کی چیرہ دستیاں جس طرح بڑھی ہیں اس سے تو یہی لگتا ہے کہ زندگی ایک بے معنی لفظ کے سوا کچھ بھی نہیں، ایک ویرانی ہے جو پھیلتی جاتی ہے، ایسے میں مولانا ولی رحمانی بھی رخصت ہوگئے، گذشتہ معارف میں ان کے لیے صحت کی دعا کی درخواست تھی، چند دنوں بعد ہی امت کا یہ راز دار خاموش ہوگیا اور وہ آواز جو صرف نوائے درد تھی خلائے بسیط میں کہیں گم ہوگئی۔

مولانا کے بارے میں یہ جملہ مستعار لیا جاسکتا ہے کہ وہ وسیع المشرب تھے، وہ سب کچھ تھے اور سب کے ساتھ تھے، ایک شخص میں اتنی صفات اور وہ بھی یکساں نہیں تنوع کی خوبیوں کے ساتھ، خانقاہ رحمانی کے زیب سجادہ، امارت شرعیہ کے امیر، مسلم پرسنل لابورڈ کے جنرل سکریٹری بلکہ روح رواں، رحمانی فاؤنڈیشن تھرٹی کے بانی، برسوں بہار مجلس قانون ساز کے چیئرمین، دیوبند وندوہ کے فاضل اور سب سے بڑھ کر ہر جماعت کے بزرگوں میں قابل اعتبار، یعنی ایک کامل انسان اور مسلمان، شخصیت کی اس جامعیت میں یقیناً روایت کا فیض صاف جھلکتا ہے، والد اگر مولانا منت اللہ رحمانی ہوں اور دادا مولانا محمد علی مونگیری، تو شخصیت میں نکھار آنا عین فطری وقدرتی ہے، مولانا ولی رحمانی نے جس طرح اپنے نامور بزرگان خانوادہ کے جمال وکمال کو جذب کیا وہ اتنا آسان بھی نہیں، علم وفضل کے ساتھ حسن انتظام، معاملہ فہمی، دور اندیشی اور نہ تھکنے والی قوت عمل، مردم شناسی اور نہایت جذباتی اور نازک مرحلوں میں خود پر قابو رکھنے اور جرأت ودانشوری کو کام میں لانے کی جو صفات ان کے والد مرحوم کی بتائی گئیں اور جن کی وجہ سے خانقاہ ہو یا امارت یا سب سے بڑھ کر مسلم پرسنل لابورڈ کو پوری ملت کا اعتماد حاصل ہوا، دیکھا جائے تو مولانا ولی رحمانی نے اس میں اضافہ ہی کیا، اس کی وجہ جو بھی ہو، مولانا دریابادی نے ایک مرتبہ اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ ''یہ میاں ولی ہیں اور ولی زادہ بھی''، اور یہ جملہ بھی بصیرت کا نمائندہ ہے کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اس مجسم ولی کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ ''نسبت کا

منتقل ہونا پڑھا اور سنا تھا، دیکھا ہے ولی میاں میں''، عقیدت منداس بنیاد پر اگر کہتے رہے تو غلط نہیں کہ اسی نسبت کی برکت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف پھیر دیا، ان کی باتوں میں کشش اوران کی تقریر میں تاثیر تو تھی ہی، وہ باتیں کرتے کرتے عجب عجب نکتے بیان کر جاتے، مثلاً ایک تقریر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں بندہ خدا سے قریب ہو، قریب رہے، اسی لیے نماز کی ہر ایک رکعت کے سارے ارکان ایک ایک بنائے گئے مگر ہر رکعت میں دو سجدوں کا حکم دیا گیا تا کہ بندہ کو خدا سے قریب تر ہونے کا زیادہ موقع دیر تک ملتا رہے، سجدہ میں انکسار ہے، تضرع ہے اور خاموشی سے یاد خدا کا موقع ہے، ان کی تقریروں کا یہی انداز تھا جو سننے والوں کو کسی اور عالم میں پہنچا دیتا، یہ اثر کہاں سے آیا؟ صاف ظاہر ہے: اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری، مولانا کے بارے میں یہ عام تاثر ہے کہ سیاست اور حکومت وقت کی نیت اور عزائم کو بھانپنے میں اوران سے اسی انداز میں نبٹنے میں کم علما ان کے ہم پلہ تھے، یاد ہے کہ اقلیتی تعلیمی کمیشن ایکٹ کے متعلق سب سے پرزور آواز انہوں نے یہ کہہ کر اٹھائی کہ وزارت قانون نے شاید بہت عجلت میں اس ایکٹ کو پیش کیا، انہوں نے اس اجمال کی جس طرح وضاحت کی وہ ان کی غیر معمولی قانونی نظر کا بھی ثبوت ہے، انہوں نے اس کی اصلاحات بھی کیں لیکن جو بات انہوں نے آخر میں کہی وہ ان کے جانے کے بعد بھی زندہ و تابندہ رہے گی، انہوں نے لکھا کہ اخیر عمر میں تجربہ کی ایک بات عرض کروں گا کہ دستوری تحفظات اور قانونی حد بندی، زندہ قوموں کی صحت مند زندگی کا ذریعہ ہوتی ہیں، یہ اسی وقت مفید ہوں گی جب اقلیتیں اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے کلیجہ میں حوصلہ اور بازو میں دم پیدا کریں ورنہ مردہ قوموں کو ریلیف اور میٹھے بول دیے جاتے ہیں اور مردہ افراد کو کفن۔

کلیجہ میں حوصلہ اور بازوؤں میں دم، یہ صرف زبانی الفاظ نہیں تھے، یہ ان کی عملی زندگی کی پہچان بن گئے تھے، وہ بار بار اس احساس کو دہراتے کہ مسائل کے ڈھیر تلے اقلیتیں اور حکومتیں دبی ہوئی ہیں، ایک کو کہنے کا سلیقہ نہیں، نئے عہد کے آداب سے واقفیت نہیں، دوسرے کو سننے کی چھٹی نہیں، حال دل جاننے کی مہلت نہیں، بچوں کے مفت اور لازمی تعلیم حاصل کرنے کے حق میں قانون آیا تو مولانا نے اس قانون کی خامیوں کو جس طرح اجاگر کیا حق یہ ہے کہ انہوں نے حق ادا کر دیا، انہوں نے مرکزی وزیر قانون کے سخت لہجہ کے جواب میں صرف یہی کہا کہ ''میں صرف قانون یاد دلا رہا ہوں''، اسی طرح

مرکزی مدرسہ بورڈ اور اقلیتوں کی تعلیم کے بارے میں ان کے مضامین پے در پے شائع ہوئے جو قانونی اور عملی مشوروں پر مشتمل تھے، تعلیم ان کے لیے اصلاح معاشرہ کی شاہ کلید تھی، وہ خالص دینی علوم کے پروردہ تھے لیکن علم کی ثنویت کے اسی درجہ منکر تھے، انہوں نے صرف زبانی ہی نہیں عصری اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے اور قوم کے بچوں کو اس راہ میں آگے رہنے کے لیے رحمانی فاؤنڈیشن کو قائم کر کے اور کامیابی کے راستوں کو ہموار کر کے جو کارنمایاں انجام دیا وہ تن تنہا ہی ان کی زندگی کے مقصد کی درستگی کے لیے کافی ہے، بات اصلاح معاشرہ کی آئی، مسلم پرسنل لا بورڈ نے سیاست کی ہر عفونت سے محفوظ رہنے کے لیے خود کو مسائل کی اصل جڑ تک محدود کیا، معاشرہ درست ہوگا تو اس میں کرشمہ سازوں کے لیے گنجائش کم ہی رہے گی، مولانا نے اصلاح معاشرہ کے لیے جس طرح پورے ملک میں تحریکیں چلائیں اور سب سے بڑھ کر مساجد کے منبر و محراب کو اس کے لیے منتخب کیا، یہ کارنامہ کبھی نہ کبھی زریں حروف کا جامہ ضرور پہنے گا۔

اب یہ سب باتیں دہرانے کی وجہ یہی دل کی خلش ہے کہ آنے والے آئیں گے، اللہ تعالیٰ ان سے کام بھی لے گا مگر وہ کہاں

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

مولانا کے عالمانہ، فاضلانہ، عارفانہ اور قائدانہ اور رندانہ امتیازات پر بہت کچھ لکھا جائے گا لیکن جو بات ہمیشہ یاد آئے گی وہ ان کی خاکساری اور چھوٹوں سے محبت اور شفقت کی صفات ہیں، وہ بظاہر بڑوں میں ہوتے لیکن کسی چھوٹے پر نظر پڑ جاتی تو اس کو بڑا بنانے میں ذرا دیر نہ کرتے، کچھ پڑھتے تو فون پر داد دیتے، ایک بار ایک بہت چھوٹے کو خط لکھا کہ آج یکم جنوری ہے، نئے سال کا پہلا خط تمہارے نام، انتقال سے چند ہفتے پہلے ایک ایسی کتاب کی تیاری کے لیے پریشان تھے جس میں ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کے عوامی تعلقات کو اختصار سے پیش کیا جائے، اس کام کے لیے وہ دارالمصنّفین ہی سے اشاعت چاہتے تھے، دارالمصنّفین کے بارے میں کچھ تشویش آمیز باتیں ان کو معلوم ہوئیں تو فوراً ایک خطیر رقم یہ کہتے ہوئے بھیجی کہ یہ ادارہ پوری قوم کی امانت اور اسلاف کی یادگار ہے اور بھی کچھ کرنے کے عزم ظاہر کیا لیکن موت کے سامنے سب بے بس ہیں، مصلحت تو اللہ ہی جانے، ہم جیسے کمزوروں کے لیے ان کا جانا دل کا لٹ جانا ہے، اس دل کا جس میں قوم و ملت کا سارا درد رہ رہ کر اٹھتا ہے، یونیفارم، سول کوڈ کے موضوع پر ان کی ایک تقریر کیا غضب کی ہے، یہاں اس کو

نقل کرنا ممکن نہیں بس ایک شعر انہوں نے خدا جانے کس عالم میں دہرایا کہ:

ہر چند بگولہ مضطر ہے، ایک جوش تو اس کے اندر ہے
ایک رقص تو ہے ایک وجد تو ہے، بے کار سہی برباد سہی

اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور ملک وقوم کو ان کے جیسا کوئی اور ملے جس کے بارے میں پھر یہ کہا جا سکے کہ: سرمایہ گداز ہے جس کی نوائے درد۔

جناب انیس چشتی مرحوم

(۱۹۴۳ـ۲۰۲۱ء)

ابھی مولانا ولی رحمانی مرحوم کی وفات کا درد تھما بھی نہیں تھا کہ ایک دو دن بعد خبر ملی کہ انیس چشتی صاحب بھی پونے میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، وہ گئے اور خدا جانے کتنی دلآویزیوں کو اپنے ساتھ لے گئے، ادیب وانشا پرداز، خطیب ومترجم ہر حیثیت سے وہ ممتاز تھے، اسی لیے فاضلین کاملین میں ان کا شمار بھی تھا لیکن ان کا اصل میدان یا ان کے لیے طرۂ امتیاز فن تعلیم تھا، اس فن کے وہ کیسے صاحب رموز واسرار تھے اس کا اندازہ کرنا یا بیان کرنا بہت مشکل ہے، ان کی ایک کتاب تعلیم شناسی ہی اس دعویٰ کے لیے کافی ہے کہ جو پانچ سے زیادہ بار طبع ہوئی، کتاب میں کیا ہے بلکہ کیا نہیں ہے؟ اس کا تعلق صرف کتاب کے مطالعہ سے ہے لیکن اس کے مختصر ترین دیباچہ میں چشتی صاحب کی یہ تحریر ذہن پر عجیب نقش چھوڑ جاتی ہے کہ ہر کام قربانی چاہتا ہے اور حصول علم سب سے زیادہ قربانی چاہتا ہے، آج دنیا میں تعلیم کا اتنا زیادہ چرچا ہونے کے باوجود بھی پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے اور جسے ہم دانشور کہیں وہ تو خال خال دیکھنے میں آتے ہیں، چشتی صاحب نے جب یہ دعویٰ کیا کہ یقین کرنا مشکل تھا مگر دعویٰ میں زور بہرحال تھا کہ اردو والوں کا سب سے بڑا رونا یہ ہے کہ ان کے سات کرور بچوں کے تعلیمی مستقبل کو سنوارنے اور سمجھنے کے لیے ان کے پاس لٹریچر نہیں کے برابر ہے، وہ سمجھتے اور سمجھاتے رہے کہ تعلیمی عمل کوئی برساتی ندی نہیں ہے کہ اس کے بہنے کا بھی کوئی خاص موسم ہو، یہ ایک مسلسل اور نہ ختم ہونے والا کام ہے، روزانہ اس کی جہتیں اور آفاق لگاتار تجربوں، نئے مفروضوں اور ضرورتوں کے تحت بدلتے رہتے ہیں، انیس مرحوم پونے میں ۱۹۴۳ء میں پیدا ہوئے،

تعلیمات میں پوسٹ گریجویشن کیا اور فزیکل ایجوکیشن میں ڈپلوما بھی لیا، تدریس سے وابستہ ہوئے لیکن ان کی اور قوم کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ان سرچشموں تک پہنچ گئے جہاں سے ان کو تعلیم کا رشتہ قوم سے جوڑنے کی تحریک ملی، وہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ان کے سرچشمہ فکر سے اس طرح وابستہ ہوئے کہ پھر کسی ساحل مراد کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ان کی ایک کتاب بدلتی دنیا اور پیاسا تعلیمی عمل ہے، اس کا ہر مضمون اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے اردو تعلیمی دنیا کے لیے نیا اور گویا عجوبہ ہے، چشتی صاحب کی یہی انفرادیت تھی کہ وہ جدت کی تلاش میں سرگرداں رہتے، اس کتاب کے سرورق پر بھی لکھا کہ ''اکیسویں صدی سے آ گئے''، وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ ملت کو مسائل کی نہیں ان کے تجزیہ اور حل کی ضرورت ہے۔

انہوں نے بیرون ہند کی سیر بھی کی اور اس سیر میں بھی وہ عام سیاح سے الگ نظر آئے، ان کی ایک کتاب وہائٹ ہاؤس کے آس پاس ہے، اس سفر میں بھی ان کی نظر نے امریکی اسکولوں کو تلاش کرلیا، انہوں نے وہاں کی تعلیم کے منہاج سے زیادہ معیار کو پانے کی کوشش کی، معلوم ہوا کہ وہاں مقابلہ آرائی بہت ہے، اسی طرح ان کا ایک اور سفرنامہ بہت مقبول ہوا، یہ وادی نیل میں بیس دن کے نام سے شائع ہوا، یہ ان ہی کے بقول صرف سفرنامہ ہی نہیں منظرنامہ بھی ہے، ان سفرناموں میں وہ ادب وانشاپردازی کی گویا معراج پر ہیں، تحریر میں انہوں نے ایک خزانہ جمع کردیا، یہی حال ان کی تقریروں کا تھا، تعلیم کے موضوع پر ایسی گل افشانی گفتار، جس نے دیکھی، سنی، وہ ان کو پھر بھلا نہیں سکتا اور اس احساس سے جدا نہیں ہوسکتا کہ اس کے علم میں اضافہ ہی ہوا ہے، چشتی صاحب کا اس طرح اچانک محفل کو ویران کرجانا بڑا نقصان وحرمان ہے، خاص طور پر ان کے لیے جو ان سے بے تکلف تھے اور خود چشتی صاحب باوجود بھاری بھرکم شخصیت کے بے تکلف ہونے میں چھوٹوں کو حفظ مراتب سے بیگانہ کردیتے تھے، ایک دلنواز تبسم ہمیشہ ان کے ساتھ ان کے دل کی صفائی کا گواہ بنا رہا، یہاں ہم ان کی کتابوں، ان کے عہدوں، ان کے اعزازوں اور ان کی کامرانیوں کو کیا بیان کریں، یہ دنیا میں ان کے کام کی مقبولیت کی علامتیں ہیں، یقین ہے کہ دنیا کی طرح آخرت میں بھی یہی قبولیتیں ان کو سرخ رو کریں گی، دارالمصنّفین کی محبت بھی جیسے ان کے خمیر میں شامل تھی، گذشتہ دنوں فون پر کچھ خدمت کرنے کی بات کی، فون پر بھی اس آہستگی سے کہ دوسرے کان کو خبر نہ ہو، محبت کے یہ انداز ہر کسی کو کہاں نصیب، اللہ تعالیٰ درجات عالیہ سے نوازے، بہت یاد آئیں گے۔ (ع۔ص)

ادبیات

تاریخ درگذشت

مولانا محمد ولی رحمانی

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

تلفنی گفت پری روز جناب وارث(۱) به من سوختة از رنج و غم کیهانی
که همیں روز سیه روز دوسه ساعت پیش حیف بد رود جهاں گفت ولی رحمانی
آنکه از دانش و دین داشته حظ وافر می بنفرید به راه و روش نادانی
در ره دانش و دیں دا و مثال در دست که رہد قوم مسلمان، زتن آسانی
بیش از نیمه سده قافلهٔ ملت را کرده بانیروی ایمان خودش رهبانی
می نترسید زکفار دم گفتن حق باورش بود به تایید ید ربّانی
دورها همدم و همکار علیؒ (۲) و طیب(۳) کارها کرده که باید به رهِ یزدانی
بهر تاریخ وفاتش چو نشستیم به فکر یاد بودی بشود تا به همه ازمانی
عدد "حسن" ۶۸ که فزودیم بگفتیم رئیس "راهی جنت فردوس ولی رحمانی"

۱۳۷۴
۶۸
۱۴۴۲ھ(۲۰۲۱ء)

قطعہ تاریخ وفات

مولانا وحید الدین خاں۔ دہلی

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

خانِ با دانش وحید الدین خان ناگهاں از حکم رب العالمین
ترک دنیای دنی گفت و بشد ره نوردِ منزل زیر زمین
آنکه بوده صاحب علم و قلم صاحب افکار و آرای نوین
علم دین و دانش امروز هم هردورا بوده است ذهن او امین
زیں سبب درمسئله ها غالباً دوربوده از راه جمهور مهین
هرچه بوده وقت اکنوں از جهاں رست از هنگامهٔ دنیا و دیں
سال فوتش با پای ابلهِ "شد وحید الدین خان زیر زمین"

۱۴۰۲
۴۰
۱۴۴۲ھ(۲۰۲۱ء)

(۱) جناب وارث ریاضی (۲) مولانا علی میاںؒ (۳) قاری محمد طیبؒ

☆ نعمانی منزل مکان نمبر ۴/۰۴۰۷، جے-۲۴، نزد ابوہریرہ مسجد، ہمدرد نگر (بی)، جمال، علی گڑھ۔

قطعہ تاریخ وفات

امیر شریعت حضرت مولانا ولی رحمانیؒ

جناب امتیاز احمد ماہرؔ

حیف گزرے زعالم فانی
میر شریعت ولی رحمانی
عالم دین زیب سجادہ
قلب صوفی مزاج سلطانی
کی گئی تھی ودیعت قدرت سے
حوصلہ عالی جذب ایمانی
ان کے حصے میں حق نے رکھی تھی
علم اور عقل کی فراوانی
ایک عرصے سے دین و ملت کی
ان کے کاندھے پہ تھی نگہبانی
تھے چراغ امارتِ شرعیہ
شمع خانقاہ رحمانی
عالم دین دانا و بینا
دور رس واقف جہاں بانی
اب دعا ہے کہ قوم و ملت کو
کوئی مل جائے آپ کا ثانی
قدر ان کی نہ ہوسکی ماہرؔ
اب تو بے سود ہے پشیمانی
ہائے نکلی[۱۶] جو دل سے تاریخ
محترم تھے ولی رحمانی
۱۴۵۸-۱۶=۱۴۴۲

بہار شریف۔

مطبوعات جدیدہ

متاعِ دل وجاں از چودھری معین الدین عثمانی، عارف ندوی سترکھی، مرتب جناب چودھری کلیم الدین عثمانی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۹۲، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: درگاہ شریف حضرت سید سالار ساہو غازی (بوڑھے بابا)، سترکھ، ضلع بارہ بنکی اور دانش محل، امین آباد پارک، لکھنؤ اور لکھنؤ کے دیگر مشہور مکتبے۔

۱۸۹۸ء میں پیدا ہونے والے نے ایک طویل عمر پائی، یعنی ۱۸۸۸ء میں عمر کی یہ مدت پوری ہوئی، شاعری کی عمر کچھ کم کر دی جائے تو بھی ساٹھ برس تو ہو ہی جائیں گے، ایک شاعر کے لیے سخنوری سے زیادہ متاع دل وجاں پیش کرنے کے لیے اور کیا ہے؟ عارف ندوی نے خدا جانے کب کہا کہ لطف قبول حسن کا ارماں لیے ہوئے۔ حاضر ہیں ہم متاع دل وجاں لیے ہوئے، لیکن وقت کو کیا کہیے کہ یہ متاع بے بہا دوسروں تک پہنچی تو ذریعہ وہ نہیں بنے بلکہ ان کے برادر زادہ کے نصیب میں یہ سعادت آئی، عارف صاحب کا تعلق سترکھ بارہ بنکی سے ہے، سترکھ کی سرزمین کو اودھ میں اسلام کے اولین نقوش کی چمک ملی تو بارہ بنکی کو زبان دانی کا فخر حاصل ہوا، عارف صاحب کی شخصیت میں ان عناصر کی کارفرمائی ہونی ہی تھی، ان کے سوانح نگاروں کے بقول وہ ندوۃ العلما کے اس اجلاس میں شریک تھے جس میں علامہ رشید رضا مصری اور علامہ شبلی گویا ایک ہی برج میں جمع تھے اور اس قران السعدین کے عارف صاحب تماشائی تھے، وہ عمر بھر اس خوبی قسمت پر نازاں رہے، بعد میں مولانا سید سلیمان ندوی سے شرف تلمذ بھی حاصل ہوا، علامہ اقبال سہیل سے بھی خاص مراسم تھے، ایسے ماحول میں اشعار کی بلندی و پاکیزگی میں شک ہی نہیں:

شوق کی گستاخ دستی کا کرم ورنہ ہم اور ان کا دامن تھام لیں
چھپائے ہیں بت آستینوں میں کیا کیا مگر پھر بھی عارف ہیں اللہ والے
کیے خوب وعدے مگر خوب ٹالے بڑے پختہ پیماں بڑے بات والے
جو گلشن میں سرمایۂ رنگ و بو تھے وہی پھول گل چیں نے سب توڑ ڈالے
کسی اور سینے میں دل ہی نہیں ہے بنالو بنالو ہمیں کو نشانہ

یہ بس چند اشعار ہیں ورنہ اس متاع دل وجاں میں ایک لفظ بھی کم قیمت نہیں، شکریہ ادا کرنا چاہیے فاضل مرتب کا جنھوں نے حق قرابت کے ساتھ دولت سعادت بھی حاصل کر لی۔ (ع۔ص)

رسید کتب موصولہ

آثار رفتگاں: محمد ثناء اللہ عمری، ایم اے عثمانیہ، فرنچ پیٹ، مچھلی بندر، ضلع کرشنا، آندھرا پردیش

قیمت ۳۰۰ روپے

ادبی ہستیاں و بستیاں: احمد ابراہیم علوی، عارف علی انصاری بک سیلر، لطیف مارکیٹ، خیرآباد، سیتاپور

قیمت ۳۵۰ روپے

اُف! (شعری مجموعہ): میکش اعظمی، بک بائنڈنگ ہاؤس، یک منارہ مسجد، تکیہ، اعظم گڑھ

قیمت ۲۰۰ روپے

بزم دانشوراں: ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی، مکتبہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

قیمت ۳۹۵ روپے

جہانِ فکر و خیال: ابوذر انصاری، نصیب منزل، دیوان شاہ کبیر (تاڑتلہ)، جونپور

قیمت ۳۰۰ روپے

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی بحیثیت مصنف: ڈاکٹر سفیر اختر، ترتیب و تقدیم: محمد عرفات اعجاز اعظمی، مکتبہ جامعہ اردو بازار، جامع مسجد دہلی

قیمت ۱۵۰ روپے

شہر غزل: ڈاکٹر شفیق اعظمی، البدر بک ڈپو، سرائے میر، اعظم گڑھ

قیمت ۳۰۰ روپے

مستند اور مفید معلومات (حصہ اول): مولانا محمد اویس قاسمی، مکتبہ نعیمیہ صدر بازار، مئو

قیمت ۱۲۰ روپے

مہاتما گاندھی، سماجی انصاف پسندی اور اردو: پروفیسر عبدالستار دلوی، نئی کتاب پبلشرز، اوکھلا مین، جامعہ نگر، نئی دہلی

قیمت ۲۵۰ روپے

میری سیاسی سرگذشت: ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، مرتب ڈاکٹر سلیم قدوائی، اردو بک ریویو ۱۰۴/ ۱۷۳۹، فرسٹ فلور، ایم پی اسٹریٹ، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی

قیمت ۲۰۰ روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	350/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم اول	300/-
شعر العجم دوم	150/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	200/-
شعر العجم پنجم	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب		قیمت
موازنہ انیس و دبیر		250/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر		100/-
سفرنامہ روم و مصر و شام		200/-
کلیات شبلی (اردو)		220/-
کلیات شبلی (فارسی)		45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)		170/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی		
مقالات شبلی دوم (ادبی)	//	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	//	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	//	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	//	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	//	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	//	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	//	110/-
خطبات شبلی	مرتبہ: عبدالسلام ندوی	150/-
انتخابات شبلی	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول	//	150/-
مکاتیب شبلی دوم	//	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)		250/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
MAY 2021 Vol - 207 (5)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/022
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

۱۔	سیر الصحابہ اول	حاجی معین الدین ندوی	300/-
۲۔	سیرت عائشہؓ	مولانا سید سلیمان ندوی	220/-
۳۔	حیات شبلی	مولانا سید سلیمان ندوی	650/-
۴۔	تذکرۃ الفقہاء اول	مولانا عمیر الصدیق ندوی	150/-
۵۔	مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	240/-
۶۔	حکیم الامت۔نقوش وتاثرات	مولانا عبدالماجد دریابادی	400/-
۷۔	علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	180/-
۸۔	تاریخ اسلام (اول ودوم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	370/-
۹۔	تاریخ اسلام (سوم وچہارم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	500/-
۱۰۔	تاریخ دولت عثمانیہ اول	محمد عزیر (علیگ)	300/-
۱۱۔	تاریخ دولت عثمانیہ دوم	محمد عزیر (علیگ)	300/-
۱۲۔	تاریخ ارض القرآن (اول ودوم)	مولانا سید سلیمان ندوی	375/-
۱۳۔	تاریخ اندلس اول	سید ریاست علی ندوی	350/-
۱۴۔	تاریخ اندلس دوم	سید ریاست علی ندوی	220/-
۱۵۔	تاریخ اندلس سوم	سید ریاست علی ندوی	300/-
۱۶۔	مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت	محمد سعود عالم قاسمی	300/-
۱۷۔	عہد اورنگ زیب میں علما کی خدمات	ڈاکٹر علاء الدین خاں	380/-
۱۸۔	تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں	ظفر الاسلام اصلاحی	100/-
۱۹۔	آثارِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	500/-